ذکرِ الٰہی

:- از افاضاتِ مبارکہ :-

واقف اسرار حقیقت ماہر شریعت و طریقت مسیح الامت

حضرت مولانا الحاج القاری الشاہ محمد مسیح اللہ خاں صاحب

عمت فیوضہم و برکاتہم

خلیفہ اعظم

حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا الشاہ محمد اشرف علی

تھانوی قدس سرہٗ

مکتبہ مسیحیہ جلال آباد مظفر نگر یوپی

دوم .... ایک ہزار

مرتب ...... مولوی وکیل احمد شروانی مدرس
جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد ۔ لاہور

ناشر ...... مولوی حافظ غلام محمد صاحب افریقی
مکتبہ مسیحیہ جلال آباد

قیمت .... ایک روپیہ آٹھ آنے

تاریخ ...... رجب المرجب ۱۳۸۷ھ اکتوبر ۱۹۶۷ء
مطبع .... نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند۔

باہتمام

مکتبہ مسیحیہ قصبہ جلال آباد ضلع مظفر نگر
(یوپی) ہندوستان

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ
وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ
مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا
مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ
فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا
اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ
سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ. اَمَّا بَعْدُ

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

وَ لَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ نَسُوا اللّٰہَ

فَاَنۡسٰہُمۡ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ

(اے مسلمانو!) تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے اللہ (کے احکام) سے بے پروائی کی (یعنی عمل بالاحکام کو ترک کر دیا، اس طرح کہ اوامر کے خلاف کیا اور نواہی کا ارتکاب کیا۔ سو اس کا اثر یہ ہوا کہ) اللہ تعالیٰ نے خود ان کی جان سے اُن کو بے پروا بنا دیا (یعنی ان کی ایسی عقل ماری گئی کہ خود اپنے نفع حقیقی کو نہ سمجھا اور نہ حاصل کیا) یہی لوگ نافرمان ہیں (اور نافرمانی کی سزا بھگتیں گے۔) (بیان القرآن)

ضروری تمہیدی باتیں

یہ ایک مختصر سی آیت ہے سورہ حشر کے اخیر کی۔ اس کے اندر دوسری آیتوں کی طرح ایک نہایت ضروری مضمون بیان فرمایا ہے۔

مستحبات کی اہمیت

قرآن پاک کا تو ہر ہر جز ضروری ہے۔ اس میں غیر ضروری کوئی بات ہے ہی نہیں حتیٰ کہ جن آیات میں واجبات اور فرائض کا بھی ذکر نہیں محض مستحبات ہی کا ذکر ہے۔ ان کا مضمون بھی ضروری ہے۔ گو آج کل مستحبات کو ضروری نہیں سمجھا جاتا، یہ صحیح ہے کہ عمل کے درجہ میں وہ واجبات اور فرائض کے برابر ضروری نہیں۔ مگر تعلیم ان کی بھی ضروری ہے اور وہ دو وجہ سے۔

ایک تو اس لئے کہ جب لوگوں کو ان کا مستحب ہونا معلوم ہو جائیگا تو کوئی ان کو ناجائز نہ سمجھے گا، یا فرض و واجب کے درجہ کا خیال نہ کرے گا یہ تو اصلاحِ اعتقاد کے لحاظ سے ضروری ہے۔

دوسرے اسلئے بھی ضروری ہے کہ ان کے برکات و ثمرات بیشمار ہیں، جن کے معلوم نہ ہونے سے ان سے بے رغبتی رہتی ہے، اگر ان برکات و ثمرات کا علم ہو جائے جو ادنیٰ ادنیٰ مستحبات سے حاصل ہوتے ہیں۔ تو آپ خود کہیں گے کہ افسوس ہم اب تک بڑے خسارے میں رہے کہ ایسے قیمتی جواہرات سے بے خبری رہی، یہ ضرورت، تکمیلِ عمل

کے درجہ میں ہے

غرض مستحبات کا ذکر بھی قرآنِ پاک میں بے ضرورت نہیں، ان کا ذکر بھی ضروری اور بہت ضروری ہے۔ اگر محبت ہو تو اس کی قدر معلوم ہو، کیونکہ عاشق صادق کا مذاق ہی جُدا ہوتا ہے وہ تو محبوب کی خوشی کی ذرا ذرا سی بات کی تلاش میں رہتا ہے، اور جب معلوم ہو جاتا ہے کہ محبوب فلاں فلاں بات سے خوش ہوتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ میں یہ بھی کروں اور وہ بھی کروں۔ کوئی بات اس کے خوش کرنے کی مجھ سے نہ رہ جائے، اگر ہم کو بھی یہی عاشقانہ مزاج نصیب ہو جائے تو اُس وقت ان مستحبات کی قدر معلوم ہو، اور ان کے بیان کو خدا تعالےٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت سمجھیں کہ واقعی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کس تفصیل سے ان ساری باتوں کو بتلا دیا جو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والی ہیں۔

مستحبات عشاق کا سرمایہ تسکین ہیں

اگر شریعت میں صرف ضروریات فرائض و

واجبات ہی کا بیان ہوتا ، مستحبات کا ذکر نہ ہوتا تو عشاق کو سخت بے چینی ہوتی کیونکہ عاشق محض ضروریات پر اکتفا نہیں کرتا۔ ان کو تو وہ فرض منصبی سمجھتا ہے بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ فرضِ منصبی کے علاوہ بھی میں کوئی ایسا کام کروں جس سے محبوب کی توجہ مجھ پر زیادہ سے زیادہ ہو،

ہمارا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارے خیالِ فاسد میں محض قانونی رہ گیا ہے اس لئے ہم فرائض و واجبات کے علاوہ مستحبات کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر ہمارا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ محبت و جاں نثاری کا ہوتا تو فرائض و واجبات پر ہم کبھی قناعت نہ کرتے، بلکہ خود ہی مستحبات کی تلاش میں لگ جاتے، اور جس بات کے متعلق بھی یہ معلوم ہو جاتا کہ حق تعالےٰ کو یہ پسند ہے، وہ اس سے خوش ہوتے ہیں، تو اس کیطرف شوق سے سبقت کرتے، اور جس بات کے متعلق یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ حق تعالےٰ کو ناپسند ہے تو اس سے کوسوں دور بھاگتے اور اس کی یہ تحقیق نہ کرتے کہ یہ زیادہ ناپسند ہے یا کم، عاشق کو تو اتنا جان لینا ہی کسی کام سے مڑنے کے لئے کافی ہے کہ یہ محبوب کی ناپسند ہے، وہ

اس تفصیل میں نہیں جاتا کہ یہ کس درجہ کا ناپسند ہے۔ آیا ایسا ناپسند ہے کہ اس کی سزا ضرب اور حبس کی دی جاتی ہے۔ یا ایسا ناپسند ہے کہ محبوب کسی قدر کبیدہ خاطر ہو جاتا ہے اور رُخ پھیر لیتا ہے، اس کے نزدیک تو یہ دونوں صورتیں برابر ہیں، عاشق تو اس کو بھی ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ محبوب اس سے کچھ بھی کبیدہ خاطر یا بے رُخ ہو جائے چہ جائیکہ کبیدگی کے علاوہ ضرب و حبس بھی ہو اس کو تو بھلا کیوں ہی گوارا کرنے لگا۔

ہمارے تعلق مع اللہ میں ضعف آگیا ہے

اب ہماری حالت یہ ہے کہ اگر کسی کام کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ یہ گناہ ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر چھوٹا گناہ ہوا تو کر لیں گے اور بڑا ہوا تو چھوڑ دیں گے

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا تعلق حق تعالےٰ کے ساتھ بہت ضعیف ہو گیا ہے گو پوری بے تعلقی بھی نہیں، کیونکہ یہ سوال بھی تعلق کی دلیل ہے۔ ان کو اتنا تعلق تو ہے کہ وہ حق تعالےٰ کو زیادہ ناراض کرنا پسند نہیں

کرتے. اگر اتنا بھی تعلق نہ ہوتا تو اس سوال ہی کی کیا ضرورت تھی؟ کہ بڑا ہے یا چھوٹا؟ معلوم ہوا کہ بڑے گناہ سے ڈرتے ہیں کیونکہ اس سے خدا تعالےٰ بہت ناراض ہوتے. مگر چونکہ زیادہ تعلق نہیں اس لئے تھوڑا سا ناراض کر دینا گوارا ہے ـــــ غرض یہی سوال، کہ کیا یہ بڑا گناہ ہے، تعلق کی بھی دلیل ہے اور ضعف تعلق کی بھی ـــ اس تقریر سے وہ لوگ خوش ہوئے ہوں گے جو گناہ کے متعلق بڑا چھوٹا ہونے کا سوال کرتے ہیں کہ حق تعالےٰ کے ساتھ ہمارا تعلق بھی ثابت ہو گیا، اور ایک درجہ میں خوش ہونے کی بات بھی ہے، کیونکہ ؏

بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے

نفسِ تعلق کافی نہیں کمالِ تعلق مقصود ہے.

مگر یہ بات بھی غور کرنے، سوچنے اور یاد رکھنے کی ہے کہ نفسِ تعلق پر قناعت نہیں ہو سکتی. آخر ہم آپس میں جو ایک دوسرے سے تعلقات رکھتے ہیں. کیا ان میں کوئی شخص نفسِ تعلق پر قناعت کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ ہر درجۂ تعلق کمال کے ساتھ مطلوب ہے، (چنانچہ) بیوی کے ساتھ جو تعلق ہے وہ ایک نہایت ضعیف تعلق ہے

جو صرف دو لفظوں (ایجاب و قبول) سے جڑ جاتا ہے اور ایک لفظ (طلاق) سے ٹوٹ جاتا ہے، مگر با وجود اس کے بیوی کے ساتھ نفسِ تعلق پر کوئی قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ ہر شخص کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ بیوی کو میرے ساتھ کامل تعلق ہو، اسی لئے محض ضروری حقوق ہی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو خوش کرنے کے لئے قسم قسم کے زیور اور لباس تیار کرائے جاتے ہیں جو اس کا حق واجب نہیں محض اپنے مصالح کی وجہ سے ان کاموں کو کیا جاتا ہے تاکہ تعلق بڑھے اور مستحکم ہو۔ اگر شوہر بیوی کے ساتھ قانونی علاقہ رکھے اور ضروری حقوق سے زیادہ کچھ نہ کرے تو گو اس میں بھی نفسِ تعلق باقی رہ سکتا ہے مگر تعلق کا لطف باقی نہیں رہ سکتا بلکہ اس صورت میں قطع تعلق کا اندیشہ لگا رہتا ہے، تعلق کو بقا جب ہی ہوتا ہے کہ اس کے استحکام کی تدبیر کی جائے۔ حالانکہ یہ تعلق نہایت ہی ضعیف ہے مگر باوجود اس ضعف کے اس کا منقطع ہو جانا ہر شخص کو ناگوار ہے۔ اگر کبھی منقطع ہو جاتا ہے تو کتنا رنج ہوتا ہے۔ اس انقطاع سے بچنے، تعلق کو باقی رکھنے اور اس کے استحکام کے لئے کیسے کیسے اسباب اختیار کئے جاتے ہیں، پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہم کو ایک ضعیف

تعلق میں تو نفس تعلق پر قناعت نہ ہو بلکہ اندیشۂ انقطاع سے اس کے استحکام کی فکر ہو اور حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق پر اکتفا گوارا؟ حالانکہ خدا تعالیٰ سے ہمارا ایسا قوی علاقہ ہے کہ اس کے برابر کوئی علاقہ ہو ہی نہیں سکتا، پھر کیا وجہ ہے کہ اس کے استحکام کی فکر ہم کو نہیں اور محض نفس تعلق کو کافی سمجھ رکھا ہے یہاں وہ خیال کیوں نہیں ہوتا کہ تعلق کا بقا استحکام پر موقوف ہے نفس تعلق بقا کے لئے کافی نہیں بلکہ اس میں زوال اور انقطاع کا خطرہ لگا ہوا ہے. کیا کوئی اس بات کو گوارا کر سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ جو اس کو علاقہ ہے۔ وہ منقطع ہو جائے؟ ہرگز نہیں، پھر اس کے استحکام کی کیوں نہیں فکر ہوتی۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن ‏ ‏ ‏ ‏ صبر چوں داری ز رب ذو المنن

اے وہ شخص کہ جس کو اپنی بیوی بچوں کو خوش رکھنے کی فکر سے کبھی فراغت نہیں ہے، تجھے اپنے سب سے بڑے محسن پروردگار کی رضا جوئی سے کیسے فراغت حاصل ہے؟ اور فرماتے ہیں کہ

اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں ‏ ‏ ‏ ‏ صبر چوں داری ز نعم الماہدوں

تجھ کو اس حقیر دنیا کی سدھار کی طرف سے تو پل بھر فرصت نہیں اور جس خدا نے کہ ساری نعمتیں فراہم فرمائیں اس کی رضا جوئی

آہ ہم سے چھوٹی چھوٹی چیزوں میں تو صبر ہو نہیں سکتا مگر نہ معلوم خدا تعالیٰ سے کیسے صبر آگیا، ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کے ساتھ ضعف تعلق ہم کو گوارا نہیں اور خدا تعالےٰ کے ساتھ نفس تعلق بھی ایک نعمت ہے مگر ضعف تعلق پر قناعت کر لینا بڑا ظلم ہے، یوں بعض لوگ تو بے تعلقی ہی پر راضی ہیں. مگر یہ کفار ہیں جن سے اس وقت خطاب نہیں.

مستحبات کی ناقدری ضعف تعلق کی علامت ہے

اور بعض لوگ ضعیف تعلق پر راضی ہیں، یہ ہم آج کل کے مسلمان ہیں، اسی کا یہ اثر ہے کہ آج کل ہم کو مستحبات کی قدر نہیں. ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ علیہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ بچپن میں میں بہت سے نوافل کا پابند تھا مگر "منیۃ المصلی" پڑھتے ہی جب معلوم ہوا کہ یہ تو مستحبات ہیں. جن کے نہ کرنے میں کچھ گناہ نہیں اسی وقت نوافل کو چھوڑ دیا، اس وقت تو تنبہ نہ ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالت بہت بری تھی.

اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ ہم حق تعالےٰ کے ساتھ ضابطہ کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں کہ بس ضروریات فرائض و واجبات کو بجا لائیں اور ان کے علاوہ جو باتیں خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کی ہیں ان کو چھوڑ دیں۔

شرعی مصلحت سے مستحب کا وقتی ترک الگ چیز ہے۔

یہ اور بات ہے کہ کسی وقت مستحب کو کسی مصلحت شرعی کی بنا پر ترک کر دیا جائے، مثلاً لوگوں کو یہ بتانے کے لئے کہ یہ فعل واجب نہیں، یا سفر میں رفقار کی رعایت سے نوافل وغیرہ کو چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ انتظار کی تکلیف سے پریشان نہ ہوں یا کسی امر ضروری میں حرج کا اندیشہ ہو یا کسی وقت تعب کیوجہ سے اپنی راحت کے سبب ترک کر دیا جائے، تو اس قسم کے ترک پر کوئی الزام نہیں۔ نیز حدیث شریف میں ارشاد ہے۔

اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا — کہ تجھ پر تیرے نفس کا بھی حق ہے۔

اور محض سستی سے بلا وجہ ترک کرنا اس سے حدیث میں پناہ آئی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ — اے اللہ میں آپ کے واسطے سے عجز اور سستی سے پناہ مانگتا ہوں۔

یاد رکھئے طلب راحت کا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امر فرمایا ہے اور اس کے لئے بعض صحابہ کو مستحبات کے ترک کرنے اور تقلیل نوافل کی ترغیب بھی دی ہے بخلاف سستی کے، کہ آپ نے اس سے پناہ مانگی ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ طلب راحت اس وقت ہوا کرتی ہے کہ جب آدمی اپنی طاقت کے موافق کام کرچکا ہو اور تعب و مشقت معلوم ہونے لگے، اُس وقت حکم یہ ہے کہ طاقت سے زیادہ کام نہ کرے جا کر آرام کرے اور اگر اپنی طاقت و ہمت کے موافق بھی کام نہ کرے تھوڑا سا کام کر کے عمل کو چھوڑ دے، تو یہ سستی ہے، اور اس سے حضورؐ نے پناہ مانگی ہے۔

مستحبات کی برکات

غرض خدا تعالیٰ کے ساتھ ہمارا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لحاظ سے مستحبات بھی ضروری ہیں —— یہ بات اس پر چلی تھی کہ خدا تعالیٰ کے کلام کا ہر ہر جزء ضروری ہے، اور اسی سلسلہ میں عرض کیا تھا کہ قرآن پاک میں مستحبات کا بھی ذکر ہے، اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے، تعلیم ان کی بھی ضروری ہے کیونکہ ان کے برکات و ثمرات بے شمار ہیں۔

مثلاً ایک برکت تو یہ ہے کہ بعض اوقات مستحبات، معصیت سے مانع ہو جاتے ہیں کیونکہ جو شخص تہجد، اشراق، چاشت، اوابین کا پابند ہوگا وہ بہ نسبت اُس شخص کے معاصی سے زیادہ بچے گا جو محض پانچ وقت کے فرائض کا پابند ہوگا اور علاوہ اس خاصیت کے ایک طبعی راز یہ ہے کہ مستحبات کی پابندی سے یہ شخص تہجد گزار، دیندار مشہور ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے گناہوں کے ارتکاب سے وہ خود بھی شرمانے لگتا ہے

دوسری برکت یہ ہے کہ بعض وقت کوئی فعل مستحب حق تعالے کو ایسا پسند آجاتا ہے کہ وہی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

سیبویہ کی حکایت

چنانچہ سیبویہ نحوی کو جو عقیدے کے لحاظ سے معتزلی تھا، مرنے کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ خدا تعالے نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ کہا مجھے بخش دیا، پوچھا کس بات پر؟ کہا کہ ایک نحو کے مسئلہ پر، اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ معرفہ کی بحث میں علماء نحو نے اختلاف کیا ہے کہ ضمائر کے اندر اَعرفُ المعارف کون سی ضمیر ہے۔؟ کسی نے متکلم کی ضمیر کو

کو اور کسی نے مخاطب کی ضمیر کو بتلایا۔ اور میں نے لفظِ اللہ کو اعرف المعارف کہا کہ اس سے بڑھ کر کوئی معرفہ نہیں۔ کیونکہ لفظ اللہ میں بجز ذاتِ حق کے کسی اور چیز کا احتمال ہی نہیں، بس حق تعالیٰ کو یہ بات پسند آگئی اور فرمایا تم نے ہمارے نام کی بہت تعظیم کی، جاؤ تم کو بخش دیا —— دیکھئے اس نحوی عالم کی مغفرت ایسے عمل پر ہوگئی جو اس نے ثواب کی نیت سے بھی نہ کیا تھا صرف مسئلہ کے طور پر ایک بات کہی تھی مگر اس پر فضل ہوگیا۔

ایک اور حکایت

اسی طرح ایک بزرگ جاڑے کی رات میں چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک بلی کے بچے کو دیکھا کہ سردی کی وجہ سے ٹھٹھر رہا ہے۔ ان کو اس پر رحم آیا اور گود میں اٹھا کر گھر لے آئے۔ اور لحاف میں چھپا لیا۔ جب ان بزرگ کا انتقال ہوگیا، تو ان سے سوال ہوا کہ بتلاؤ ہمارے واسطے کیا لائے ہو انہوں نے سوچا کہ اعمال تو میرے کسی قابل نہیں ہیں کہ ان کو پیش کردوں، لیکن الحمد للہ مجھے ایمان کی دولت حاصل ہے، اس میں ریاء (دکھاوا) وغیرہ بھی کچھ نہیں ہوسکتا، ایمان کو پیش کرنا چاہیئے۔ اس لئے عرض کیا کہ

"میں توحید لایا ہوں"۔ اس پر ارشاد ہوا :

اَتَذْکُرُ لَیْلَةَ اللَّبَنِ
کیا دودھ والی رات بھی یاد ہے؟

تم نے ایک دن دودھ پینے کے بعد پیٹ میں درد ہو جانے پر کہا تھا کہ "دودھ نے پیٹ میں درد کر دیا" کیا یہی توحید ہے کہ درد کے فعل کو اس کی طرف منسوب کیا، ہم کو چھوڑ کر دودھ کو مؤثر قرار دیا. حالانکہ مؤثر حقیقی تو ہم ہیں. اب تو یہ بیچارے تھرا اٹھے، ارشاد ہوا تم نے اپنے دعوے کی حقیقت تو دیکھ لی، اب ہم تم کو ایسے عمل پر بخشتے ہیں، جس کے متعلق تم کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ یہ موجب نجات ہو جائے گا. تم نے ایک رات ایک بلی کے بچہ پر جو سردی میں ٹھٹھر رہا تھا رحم کھا کر اپنے لحاف میں سلا یا تھا. تم نے ہماری مخلوق پر رحم کیا ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم پر رحم کریں، جاؤ ہم نے تم کو بخش دیا۔

مستحبات میں یہ عنایات و برکات ہوتے ہیں. احادیث میں ایسے بہت سے واقعات آئے ہیں کہ جن کی ادنیٰ ادنیٰ فعل پر مغفرت ہو گئی۔

ایک فاحشہ عورت کی حکایت

چنانچہ ایک فاحشہ عورت کا واقعہ حدیث میں

آتا ہے کہ اس نے دوپہر کے وقت ایک کتے کو دیکھا جو پیاس کے مارے زمین کی تری چاٹ رہا تھا، اس کو رحم آیا، پاس ہی ایک کنواں تھا. مگر اس پر ڈول رسّی نہ تھے کہ اس سے نکال کر پانی پلائے. اس نے اپنے دوپٹہ کو رسّی بنایا اور چمڑے کے موزہ کو ڈول بنایا، اس طرح پانی نکال کر کتے کو پلایا، کچھ دنوں بعد اس کا انتقال ہو گیا. حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس فاحشہ کی مغفرت اسی پر ہو گئی، واقعی سچ ہے کہ ؎

رحمتِ حق بہانہ می جوید — رحمتِ حق بہا نمی جوید

(اللہ کی رحمت (مغفرت کے لئے کوئی) بہانہ تلاش کرتی ہے۔

وہ کسی قیمت کی طلبگار نہیں ہے)

میرے دوستو! کسی عمل کو حقیر اور چھوٹا نہ سمجھو، نہ معلوم کونسا کام میاں کو پسند آجائے، آج کل اس مذاق کے بھی لوگ ہیں کہ رحمت کے واقعات سُن کر عمل کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔

حکایات و واقعات فی نفسہ بڑے مؤثر ہیں مگر تاثیر پذیری شرط ہے۔

ان حکایات کی مثال بارش جیسی ہے

اور یہی کیا جتنی بھی نصوص ہیں سب کی مثال یہی ہے۔ بارش فی نفسہٖ نہایت لطیف اور روح پرور ہے مگر اس کا اثر ہر محل کی قابلیت اور عدم قابلیت کے مناسب جُدا جُدا ہوتا ہے۔ عمدہ زمین ہے تو بارش سے اس میں پھول، پھلواری اور عمدہ پھل پیدا ہوں گے۔ اور اگر شور زمین ہے تو اس میں جتنی بارش ہوگی اتنے ہی کانٹے، جھاڑ جھنکار پیدا ہوں گے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

بارش کی طبعی لطافت (اور اثر) میں کوئی اختلاف نہیں (زمین پہ منحصر ہے اگر) باغ میں برستی ہے تو لالہ اُگتا ہے اور کھاری زمین جھاڑ جھنکار اُگاتی ہے اسی طرح واقعات رحمت سُن کر مختلف المزاج لوگوں پر مختلف اثر ہوتے ہیں، جو لوگ مزاج کے علیل اور غیر سلیم الطبع ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ ذرا سے نقطہ پہ بخش دیتے ہیں تو پھر عمل صالح کی کیا ضرورت ہے، اور جو سلیم الطبع ہیں وہ واقعات رحمت اور بیان رحمت سُن کر پہلے سے زیادہ طاعت کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں

اور کہتے ہیں ؎

تصدق اپنے خدا کے جاؤں یہ پیار آتا ہے مجھ کو انشا
اِدھر سے ایسے گناہ پیہم، اُدھر سے وہ دم بدم عنایت

بلکہ بعض اوقات تو بدون سزا کے معافی دینے پر اہلِ دل اس قدر شرمندہ ہوتے ہیں کہ کچھ سزا مل جاتی تو اتنے شرمندہ نہ ہوتے، سنگین جُرم کو ویسے ہی معاف کر دینا گویا ان کو ذبح کر دینا ہے، مارے ندامت کے وہ زمین میں گڑ جاتے ہیں، جس پر گذرتی ہے وہی اس کو سمجھ سکتا ہے۔

واقعہ اُحد کی مثال

اور جس نے اس حالت کو سمجھا ہوگا وہ اس آیت کی تفسیر کو بے تکلف سمجھ لے گا، فرماتے ہیں:

فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا

سو خدا تعالیٰ نے تم کو پاداش میں غم دیا بسبب (تمہارے) غم دینے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے تاکہ (اس پاداش و مصیبت سے تم میں پختگی پیدا ہو جائے جس سے پھر) تم مغموم نہ ہو۔

تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ شروع ہونے سے پہلے جب لشکر کی صف بندی فرمائی تو پچاس صحابہ کو پہاڑی کی ایک گھاٹی پر مقرر فرما دیا تاکہ قریش اس پہاڑی کے پیچھے سے حملہ نہ کر سکیں اور ان کو ارشاد فرمایا کہ تم یہاں سے بدون میری اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا خواہ ہمارے اوپر کچھ ہی حالت گذر جائے ـــــ اس انتظام کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حملہ کی اجازت دی۔ بفضلہ تعالیٰ تھوڑی سی دیر میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گئی اور کافروں کو شکستِ فاش ہوئی۔ ابوسفیان ابن حرب اُس وقت لشکر کفار کے سردار تھے مع لشکر بھاگ پڑے، اور جھنڈا جو ان کے ہاتھ میں تھا وہ بھی گر پڑا، مسلمان ان کے تعاقب میں دوڑے، اب اُن پچاس صحابہ میں (جن کو درّہ کی حفاظت کے لئے بٹھایا تھا) اختلاف ہُوا، بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہو گئی ہے اس لئے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کے لئے ہم کو مقرر فرمایا تھا وہ غرض پوری ہو گئی اس لئے اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں، اور یہاں سے ہٹنے میں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی مخالفت ہوگی، اور ہم نے جنگ میں
اب تک کوئی حصہ نہیں لیا ہم کو بھی کچھ کرنا چاہیئے، ہمارے بھائی
کفار کا تعاقب کر رہے ہیں، ہم کو مالِ غنیمت جمع کر لینا چاہیئے، مگر بعض
نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف
فرمادیا تھا کہ بدوں میری اجازت کے یہاں سے ہرگز نہ ہٹنا، اس
لئے ہم کو ہرگز یہاں سے نہیں ہٹنا چاہیئے، مگر پہلی رائے والوں نے
نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول
ہوگئے۔ یہ اُن کی اجتہادی غلطی تھی۔ اب گھاٹی پر صرف دس آدمی اور
ایک اُن کے افسر رہ گئے۔ خالد بن ولید جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے
تھے وہ کفّار کے لشکر کی طرف تھے۔ اور یہ ہمیشہ سے مدبّر اور جنگ آزمودہ
تھے۔ انہوں نے اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے تاکہ اس گھاٹی کی خبر
ان کو وقتاً فوقتاً پہنچاتے رہیں، چنانچہ اس وقت جبکہ خالد بن ولید
کفّار کے لشکر کیساتھ بھاگے چلے جا رہے تھے ان کے جاسوسوں
نے اطلاع دی کہ اب وہ مورچہ خالی ہے اور بجز دس گیارہ آدمیوں کے
وہاں کوئی نہیں خالد بن ولید نے بھاگتے بھاگتے اپنے رُخ پلٹا اور

یا پانچ سو جوانوں کے ساتھ اس گھاٹی پر پہنچ گئے، وہ دس گیارہ صحابی جو وہاں باقی رہ گئے تھے ان سے مقابل ہوئے اور تھوڑی دیر میں سب شہید ہو گئے، پھر خالد بن ولید نے مسلمانوں کے پیچھے سے آکر ان پر حملہ کر دیا۔ یہ رنگ دیکھ کر کفار کا باقی لشکر بھی ٹوٹ پڑا۔ اور مسلمان آگے پیچھے دونوں طرف سے نرغہ میں آ گئے اور جس خطرہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گھاٹی کی حفاظت فرمائی تھی۔ اُس خطرہ کا سامنا ہو گیا چنانچہ ستر کے قریب مسلمان شہید ہوئے اور شیطان کی اس جھوٹی آواز پر کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل کر دیئے گئے۔ بہت سوں کے پیر اکھڑ گئے اور جنگ کا نقشہ ہی بالکل پلٹ گیا۔ یہ سب کچھ ہوا، مگر مسلمانوں کو شکست نہیں ہوئی۔ کیونکہ شکست کے معنی یہ ہیں کہ لشکر مع سردار بھاگ جائے اور یہاں ایسا نہیں ہوا۔ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع چند جاں نثاروں کے برابر میدان میں جمع رہے۔ آپ کبھی نہیں بھاگے، تھوڑی دیر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ صحابہ کو پکاریں، چنانچہ ایک آواز پر فوراً سب مسلمان میدان میں جمع ہو گئے۔

خدا تعالیٰ نے اس واقعہ میں مسلمانوں پر مصیبت آنے کا سبب ان صحابہ کرام کی اجتہادی غلطی کو قرار دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر گھاٹی سے ہٹ گئے تھے، چنانچہ ارشاد ہے۔

وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرٰىكُمْ مَا تُحِبُّوْنَ

اور تم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) کہنے پر چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دلخواہ بات (آنکھوں سے) دکھلادی تھی (یعنی مسلمانوں کا غلبہ دکھا دیا تھا)

اس کے بعد بطور عتاب فرماتے ہیں کہ

فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ (آل عمران: ۱۶ ع ۱)

سو خدا تعالیٰ نے تم کو پاداش میں غم دیا بسبب (تمہارے) غم دینے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو)

اس کے بعد اس انتقام کی حکمت ارشاد فرماتے ہیں کہ

لِكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ

تاکہ تم کو انتقام لے لینے کے بعد اس پر زیادہ رنج و غم نہ ہو جو تم سے فوت ہو گئی تھی۔

یہ بات اس پر چلی تھی کہ بعض شریف طبیعتوں پر انتقام نہ لینے سے ندامت زیادہ غالب ہوتی ہے اور انتقام لے لینے سے ندامت کم ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر ارشاد ہے کہ ہم نے تم کو تھوڑی سی مصیبت اس لئے دے دی تاکہ بدوں سزا کے معافی دے دینے سے تم پر ندامت اور رنج کا اثر زیادہ نہ ہو۔ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق جانثار تھے، اگر ان کی خطا بدوں کسی انتقام کے معاف کر دی جاتی تو عمر بھر مارے ندامت کے آنکھ نہ اُٹھا سکتے، تھوڑی سی مصیبت میں مبتلا کر دیا تاکہ زیادہ رنج نہ ہو۔۔۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ سزا ہمیشہ رنج دینے کے لئے ہی ہوتی ہے۔ بلکہ بعض دفعہ رنج ہلکا کرنے کے لئے بھی دی جاتی ہے۔

واقعاتِ رحمت سُن کر دلیری، سقیم المزاج ہونے کی علامت ہے۔

یہ بات اس پر چلی تھی کہ بعض لوگ واقعاتِ رحمت سُن کر عمل کی ضرورت نہیں سمجھتے، بلکہ اور دلیر ہو جاتے ہیں۔ تو اب بتلائیے کہ جس شخص کی یہ حالت ہو کہ خطا کر کے بدوں سزا

کے اسے چین ہی نہ آئے، وہ واقعاتِ رحمت سن کر گناہوں پر دلیر ہوگا؟ یا غیرت سے زمین میں گڑ جائے گا۔ یقیناً جو لوگ صحیح المزاج ہیں اور جن کو خدا تعالیٰ سے محبت کا تعلق ہے وہ تو واقعاتِ رحمت سن کر پہلے سے زیادہ طاعت پر گریں گے، وہ غلام نہایت درجہ کا کمین اور بدتر ہے کہ جس کی خطا بدوں سزا کے معاف کردی جائے اور پھر وہ ناز کرنے لگے یا نافرمانی پر دلیر ہوجائے ـــ اور شریف ہے وہ شخص جو آقا کی اس عنایت کو دیکھ کر عمر بھر کے لئے گڑ جائے، اسی لئے کہا گیا کہ جو لوگ واقعاتِ رحمت سن کر عمل میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں وہ سقیم المزاج ہیں۔ ان کو اپنی اصلاح کی فکر چاہیئے۔ اور حق تعالیٰ کے ساتھ محبت کا تعلق پیدا کرنا چاہیئے۔ اس کا طریق یہ ہے کہ عرصہ تک اہلِ محبت کی صحبت اختیار کیجائے پھر ان پر مستحبات کے برکات ومنافع سن کر اُلٹا اثر نہ ہوگا اور بجائے غلط فائدہ اُٹھانے کے صحیح فوائد ان مستحبات کی بدولت حاصل کرلیں گے اور عمر بھر کا دِلدّر دھل جائے گا۔ تو یہ کتنی بڑی رحمت ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو مستحبات کی تعلیم فرمائی،

نفسِ موضوع کیطرف رجوع

اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ قرآن پاک کا ہر ہر جز ضروری ہے، اور مستحبات بھی تعلیم کے درجہ میں نہایت ضروری ہیں، اور باعتبار ثمرات کے عمل میں بھی ایک گونہ ضروری ہیں پس یہ دعویٰ صحیح ہے کہ خدا تعالےٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا ہر ہر جز ضروری ہے، اور یہ بھی کہنا صحیح ہو گیا کہ اس آیت میں مثل دوسری آیت کے ایک نہایت ضروری مضمون ہے جس میں حق تعالےٰ نے ہماری بدحالی کا ایک نہایت سہل علاج بیان فرمایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم لوگ بدحال ضرور ہیں، کوئی شخص بھی اس سے بری نہیں۔ مگر اتنا فرق ہے کہ کسی کی تباہی کم ہے۔ اور کسی کی زیادہ، باقی بدحالی میں سب مبتلا ہیں اِلا ماشاء اللہ۔

پریشان وہی ہیں جو کم درجہ کے بدحال ہیں

اور جن کی بدحالی کم ہی وہ بہ نسبت اُن لوگوں کے زیادہ پریشان ہیں۔ جن کی تباہی و بدحالی زیادہ ہے۔ اس لئے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس مضمون کی ضرورت صرف ان ہی لوگوں کو ہے جو زیادہ تباہ حال ہیں اور جو کم تباہ حال ہیں

ان کو ضرورت نہیں، یا کم ضرورت ہے. نہیں بلکہ جن کی تباہ حالی کم ہے ان کو اس سے زیادہ ضرورت ہے کہ وہ بہ نسبت دوسروں کے زیادہ پریشان ہیں ___ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ جن پر قرض بہت زیادہ ہو جاتا ہے بہ نسبت اُن لوگوں کے زیادہ بے فکر رہتے ہیں جن پر قرض تھوڑا سا ہوتا ہے کیونکہ ان کو تو قرض لیتے لیتے ایک قسم کی عادت پڑ جاتی ہے جس کی وجہ سے اُن کو اس کے بار کا احساس ہی نہیں رہتا، اور جس کو قرض لینے کی عادت نہ ہو، اگر اس کے ذمہ تھوڑا سا بھی قرض ہو جائے جس کے ادا ہونے کی توقع بھی ہو تو وہ زیادہ پریشان ہوتا ہے. بعض دفعہ اس کو رات رات بھر نیند نہیں آتی، یہ بیچارہ ان لوگوں کی حالت پر تعجب کرتا ہے جو ہزاروں کے مقروض ہو کر بھی رات کو چین سے سو جاتے ہیں.

مصیبت کی فکر اسی کو ہوتی ہے جس کو اس کے ازالہ کی اُمید ہو

راز اس میں یہ ہے کہ مصیبت کی فکر اسی وقت ہوتی

ہے جب تک کہ اس کے زوال کی امید ہو، اور جب زوال کی امید ختم ہو جائے پھر فکر نہیں رہتی، بلکہ وہ طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے، جیسے دائمی مرض طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ گناہ کم کرتے ہیں، وہ زیادہ مغموم و پریشان رہتے اور جو زیادہ کرتے ہیں، .... وہ زیادہ پریشان نہیں کیونکہ وہ تو ایک قسم کے بے حس ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات انسان کثرت گناہ کے سبب مایوس ہو جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اب میری معافی تو ہو ہی نہیں سکتی پھر لذت میں بھی کیوں کمی کروں؟ اب وہ دِل کھول کر گناہ کرتا ہے حتیٰ کہ جب مرنے کا وقت قریب آتا ہے تو اُس وقت بھی توبہ واستغفار نہیں کرتا، اگر اس سے اس وقت توبہ واستغفار کو کہا جائے تو صاف انکار کر دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اتنے گناہوں کو ایک توبہ کیا کام دے گی؟ —— چنانچہ ابن القیمؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص کو مرتے وقت جب کلمہ پڑھنے کو کہا گیا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ایک کلمہ سے کیا ہو گا؟ میرے تو اسقدر گناہ ہیں کہ ان کو ہزار کلمے بھی نہیں دھو سکتے، یہ مایوسی ہی تو تھی جس نے اسکو

کلمہ سے باز رکھا۔ اور خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔ تو بعض دفعہ کثرتِ گناہ انسان کو مایوس بنا کر کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ اللہ تعالےٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، (آمین)

بعض دفعہ طاعات بھی بُرا اثر پیدا کر جاتی ہیں

اور کثرتِ گناہ میں تو یہ اثر ہے ہی، مگر آپ حیرت کریں گے کہ بعض دفعہ طاعات میں بھی یہی اثر پیدا ہو جاتا ہے، یہ بات کسی اور کے ذہن میں نہیں آسکتی تھی، مگر قربان جائیے اس معلّم امی ؐ کے کہ جس کو خود خدا ہی نے سکھلایا پڑھایا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ	میرے رب نے مجھے (دین کی)
تَعْلِیْمِیْ	بہترین تعلیم دی۔
وَاَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ	اور مجھ کو میرے رب نے بہترین
تَادِیْبِیْ	ادب سکھایا۔

جب آپ تعلیم الٰہی سے اس طرح مشرف ہوں تو آپ کی نظر جتنی دور بھی پہنچے کم ہے۔

دیکھئے! آپ کی دوررس نگاہ کتنی دور پہنچی کہ بعض مرتبہ اعمالِ خیر پر بھی بُرا اثر مرتب ہو جاتا ہے۔

طاعات کی بھی ایک حد ہے

بظاہر تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ طاعت جتنی بھی ہو اچھی ہے طاعت کے لئے کوئی حد نہ ہونی چاہیئے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راز کو بخوبی سمجھا کہ طاعت کے لئے بھی ایک حد ہے اور اسی حد تک وہ محمود ہے اس سے آگے بڑھنا اچھا نہیں ورنہ بُرا اثر پیدا ہوگا —— اس کی ایسی مثال ہے جیسے مریض کی دوا کرنا اچھا ہے لیکن دوا کرنے کی بھی ایک حد ہے۔ اگر کوئی مقدار ضرورت سے زیادہ دوا کھائے گا تو اس پر نتیجہ بُرا مرتب ہوگا۔ یہی حال طاعات کا ہے کہ ان کے لئے بھی ایک حد ہے۔ گو وہ فی نفسہٖ اچھی چیزیں ہیں، مگر جو روحانی اطباء ہیں جیسے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور ان کے متبعین، انہوں نے بتلا دیا کہ طاعات بھی دوا کی طرح ہیں۔ جیسے ہر دوا کے لئے ایک مقدار مقرر ہے کہ اس سے زائد نقصان دہ ہے! ایسے ہی طاعات کیلئے

بھی درجات متعین ہیں کہ اس حد تک مفید اور اس سے زائد مضر، چنانچہ خوف الٰہی ایک بڑی طاعت ہے جس کے اختیار کرنے کا جابجا نصوص میں حکم ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی ایک حد بیان فرمادی. چنانچہ ایک دعا میں آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ مِنْ	اے اللہ میں آپ کا صرف اتنا
خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ	خوف طلب کرتا ہوں جو مجھ میں اور
بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ	گناہوں میں حائل ہو جائے۔

اس میں آپ نے بتلا دیا کہ خوف طبعی کا ہر درجہ مطلوب نہیں بلکہ صرف اسی قدر مطلوب ہے کہ خدا کی نافرمانی سے روک دے۔

طاعات میں حد مقرر فرمانے کی مصلحت

کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ خوفِ طبعی کا زیادہ بڑھ جانا مضر ہے. ایسے شخص کی ہر وقت حق تعالیٰ کے قہر ہی پر نظر ہوتی ہے، وہ کسی عمل بد کو

قابل معافی نہیں سمجھتا اور عظمت الٰہی کے سامنے اس کو اپنا کوئی عمل قابلِ قبول نظر نہیں آتا جس سے اس کو نجات کی توقع نہیں رہتی، نتیجہ یہ کہ ایسا شخص رحمتِ حق سے مایوس ہو جائے گا اور مایوسی کفر ہے تو کیا ٹھکانہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس راز دانی کا ؟ بھلا کون شخص اس کو تجویز کر سکتا ہے کہ کثرتِ طاعت بھی مضر ہو سکتی ہے مگر قربان جائیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ نے اس کو سمجھا کہ بعض دفعہ غلبہ خوف (جو کہ طاعات میں سے ایک طاعت ہے) سببِ مایوسی ہو جاتا ہے. حق تعالیٰ کا ارشاد ہے.

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (یوسف: ۸۷)	بے شک نہیں ناامید ہوتے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں.

اسی لئے تو آپ نے خوف کے سوال میں یہ قید لگا دی.

مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ.	کہ میں اتنا خوف مانگتا ہوں. جو ہمارے اور معاصی کے درمیان حائل ہو جائے.

حکماء قدیم (فلاسفہ) نے انبیائی علوم کی تصدیق کی ہی مگر اپنے حق میں قبول نہیں کیا!!!

یہی تو ہیں وہ علوم اور حقائق جن کو دیکھ کر حکماء بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے اپنی کتابوں میں نبوت کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے کہ بعض افراد ایسے ہو سکتے ہیں جن پر بلا واسطہ مبداءِ فیاض کی طرف سے علوم کا فیضان ہو۔ اسی وجہ سے کسی حکیم نے اپنے زمانہ کے نبی کی نبوت کا انکار نہیں کیا۔ بلکہ وہ انبیاء کرام کے علوم و معارف دیکھکر کہا کرتے تھے کہ اتنا بڑا علم کسی ریاضت و تعلیم سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا، مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی غلطی کی کہ کہتے تھے کہ یہ نبی تو بیشک ہیں مگر ہمارے لئے نہیں صرف امی جاہلوں کے واسطے ہیں۔ ہم کو ان کے اتباع کی ضرورت نہیں ہم نے تو اپنے نفوس کو علوم اور ریاضات سے مہذب بنا لیا ہے، ہم نے تو اپنے نفوس کی خود اصلاح کر لی ہے۔ ہم کو کسی مُصلح کی ضرورت نہیں، اور بقول بعض مفسرین اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ایسے ہی حکماء کے بارے

میں وارد ہے۔ فرماتے ہیں، کہ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (مومن: ۸۳)

غرض جب ان کے پیغمبر اُن کے پاس کھلی اور واضح دلیلیں لیکر آئے تو وہ لوگ اپنے اس علم (معاش) پر بڑے نازاں ہوئے جو ان کو حاصل تھا (یعنی معاش کو مقصود سمجھ کر اور اس میں جو ان کو لیاقت حاصل تھی اس پر خوش ہوئے اور معاد یعنی آخرت کا انکار کر کے اس کی طلب کو دیوانگی اور اس کے انکار پر وعید عذابی کو مایہ تمسخر ٹھہرایا) اور اس کے وبال میں) ان پر وہ عذاب آپڑا جس کے ساتھ وہ تمسخر کرتے تھے۔

ان کا یہ کہنا ایسا ہی تھا جیسے بعض یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کر کے یہ کہتے تھے کہ آپ نبی تو ہیں مگر صرف اہل عرب کے لئے ہمارے لئے نہیں، کیونکہ ہم خود صاحب کتاب ہیں اور وہ کتاب ہمارے لئے مؤید ہے ــــــ اس کا جواب تو ظاہر ہے کہ جب تمہارے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں اور نبی کیلئے صادق ہونا ضروری ہے تو وہی نبی یہ بھی فرماتے ہیں جس کا خلاصہ

یہ ہے کہ

"میں تمام عالم کیطرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور سب پر میرا اتباع لازم ہے، بدوں میرے اتباع کے کسی کی نجات نہیں ہو سکتی"۔

پھر تم ان کے اس قول کو کیوں نہیں تسلیم کرتے. حالانکہ جب یہ تسلیم ہے کہ نبی کی بات جھوٹی نہیں ہو سکتی تو لامحالہ اس بات میں بھی سچا ماننا پڑے گا کہ میں تمام عالم کیطرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور اس کا سچا ماننا تمہارے اس قول کے عدمِ صحت کو مستلزم ہے کہ وہ خاص اہلِ عرب کے رسول ہیں، ہمارے واسطے نہیں.

تو جسطرح یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں خاص عوام کے لئے نبی کہتے تھے، مگر انبیاء کرام علیہم السلام کے علوم عالیہ کیوجہ سے نبوت کا انکار نہیں کیا بلکہ اس کی حقیقت کو تسلیم کر کے اپنی کتابوں میں علم النومیس کے عنوان سے اس کو ذکر کیا ہے۔

آجکل کے نام نہاد حکماء دراصل حکماء ہی نہیں وہ آجکل کے حکماء

کی طرح نہ تھے۔ کہ جو سرے سے نبوت کی حقیقت ہی کا انکار کرتے ہیں
درحقیقت یہ حکماء حکماء ہی نہیں بلکہ واقع میں یہ لوگ صناع ہیں کہ
عجیب و غریب صنعتوں کے موجد ہیں، ہر چند کہ صنعت بھی مفید چیز اور
نہایت کار آمد شے ہے مگر صرف اسی وقت تک جب تک کہ غیر محل
میں استعمال نہ کیجائے۔ مگر اس سے آدمی حکیم تو نہیں بن سکتا،
حکمت تو علوم معانی سے حاصل ہوتی ہے اور حکماء عصر کے پاس
معانی کا نام بھی نہیں، اس لئے وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے علوم
کی قدر نہیں جان سکتے اور یہی وجہ ہے، اُن کے انکار نبوت کی۔

یہ بات اس پر چلی

اصل مضمون کیطرف رجوع

تھی کہ بعض دفعہ

اعمال خیر پر بھی بُرا اثر مرتب ہوجاتا ہے، جس کو حضور صلی اللہ علیہ
وسلم نے ظاہر فرمایا ہے ـــــــ اور یہ بات اس پر شروع
ہوئی تھی کہ بعض دفعہ زیادہ گناہوں کی وجہ سے انسان کو مایوسی
ہوجاتی ہے۔ تو وہ دل کھول کر گناہوں پر دلیر ہوجاتا ہے۔ اب
اس کو گناہوں سے زیادہ پریشانی نہیں ہوتی اور جس نے

تھوڑے گناہ کئے ہیں وہ رحمت و مغفرت سے مایوس نہیں ہوتا بلکہ اس کو اُمید رہتی ہے اور اسی اُمید کی وجہ سے معاصی سے بچنے کی فکر میں رہتا ہے، اسی لئے کہا تھا کہ جو لوگ کم تباہ حال ہیں ان کو اس مضمون کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ وہ زیادہ پریشان ہیں عام طور پر تو یہی خیال ہوتا ہے کہ کثرت سے گناہ کرنے والے کو زیادہ پریشانی ہوتی ہوگی مگر واقع میں اس کے عکس ہے کہ تھوڑے گناہ کرنے والے زیادہ پریشان ہوتے ہیں اور زیادہ کرنے والے کم۔

معصیت میں خواص کا حال

اور ان میں سے بھی جو خاص لوگ ہیں ان کی تو یہ حالت ہے، سے

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود　　گر ز باغ دل خلالے کم بود

سالک کے دل کے باغ میں سے اگر ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے تو اُس کے دل پر ہزاروں غم سوار ہو جاتے ہیں،

یعنی گناہ تو گناہ، اگر اس کی قلبی حالت میں ذرا بھی تغیر ہو جاتا

ہے تو اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ اُس وقت اگر کوئی کامل محقق مل گیا تو اس کی تسلی سے سنبھل جاتا ہے ورنہ بعض دفعہ ہلاکت تک کی نوبت آجاتی ہے۔ مولانا رومی رح عجیب تحقیق کی بات فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبض آمد تو در وے بسط بیں | تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

جب قبض (کی حالت) پیش آئے اس میں بسط (ذوق و شوق کی کیفیت) کو ملاحظ کرو اور خوش خرم رہو۔ پیشانی پر بل نہ ڈالو،

حالتِ قبض بھی نافع ہے

گو قبض سے پریشانی کا ہونا تو طبعی اور لازمی امر ہے مگر شیخ کامل کی تسلی کے بعد بھی عقلاً پریشان رہنا یہ بُرا ہے، یہ تسلی اُن منافع اور مصالح پر ہوتی ہے جو اکثر قبض (کی کیفیت) پر مرتب ہوتے ہیں۔ اور یہ قبض کا باقی رہنا نہ حائے تعجب ہے اور نہ منافیِ کمال۔

؎ ذوق و شوق، تلاوت میں دل لگنا، نماز میں حلاوت کا محسوس ہونا ذکر میں دل لگنا وغیرہ وغیرہ ان چیزوں کے انقطاع کا نام قبض ہے۔ اور ان چیزوں کے حصول کا نام بسط ہے۔

ہم اور آپ تو کیا چیز ہیں خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اوّل بار وحی نازل ہوئی تو پہلے دن ثقل وحی سے یا خوف و عظمت الٰہی سے آپ پر لرزہ طاری ہو گیا گھبرائے ہوئے غارِ حرا سے دولت کدہ پر تشریف لائے اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے، سکون کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو توریت و انجیل کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے وحی کا قصہ سُن کر آپ کو نبوت کی بشارت دی۔ اور کہا کہ افسوس ایک دن آپ کی قوم آپ کو مکّہ سے نکالے گی۔ اگر میں زندہ رہا تو آپ کی پوری پوری مدد کروں گا، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔
اس وقت آپ اس قدر پریشان ہوئے کہ بعض دفعہ پہاڑ پر چڑھ کر ارادہ کرتے کہ یہاں سے گر کر اپنے آپ کو ہلاک کر دوں، یہ کیا تھا؟ یہ قبض ہی تو تھا جس کی وجہ سے حضورؐ کی یہ حالت ہو جاتی تھی۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حالت سے "قبض" کی سند ملتی ہے۔ کہ یہ کوئی خلافِ شرع کیفیت نہ تھی۔ ورنہ حضور پر کیوں طاری ہوتی اِسی کو مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

بر دل سالک ہزاران غم بود
گر ز باغ دل خلالے کم بود

سالک کے دل کے باغ سے اگر ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے تو اس کے دِل پر ہزاروں غم سوار ہو جاتے ہیں۔ یہ اشتیاقِ وحی ہی تو تھا جس میں آپؐ بے چین ہو گئے تھے۔ اس بے چینی کی حالت میں جبرائیل علیہ السلام ظاہر ہوتے اور آپؐ کی تسلی فرماتے، کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اس امت کے نبی ہیں۔ اللہ تعالے نے آپ کو رسول بنایا ہے آپؐ گھبرایئے نہیں۔ تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی تو دوسرا کون ہے جو قبض پر خوش ہوا ور ذرا بھی پریشان نہ ہو۔ البتہ اس کے منافع و مصالح کے استحضار سے قلب کو ایک گونہ شگفتگی حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر ان مصالح کا علم کبھی تو اجمالی ہوتا ہے جیسا کہ مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو
آن صلاح تست آیس دل مشو

اے سالک جب تجھے قبض پیش آئے تو تُو اس سے دِل گرفتہ نہ ہو

کیونکہ یہ تیری اصلاح کا ذریعہ ہے،

اس شعر سے اجمالاً معلوم ہو گیا کہ قبض میں بھی مصالح ہوتے ہیں اور یہ کوئی بُری حالت نہیں جس سے سالک (جو راہ سلوک طے کر رہا ہے) اپنے کو مردود سمجھنے لگے، آگے فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبض آمد تو در وے بسط بیں

تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

جب قبض پیش آئے تو اس میں بسط (ذوق و شوق کی کیفیت) کا ملاحظہ کرو اور خوش و خرم رہو پیشانی پر بل نہ ڈالو۔

اس میں بتا دیا کہ حالتِ قبض کے بعد حالتِ بسط (ذوق و شوق کی کیفیت) بہت قوی ہوتی ہے۔ اس شعر میں لفظ "در" ایسا ہے جیسا کہ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ میں لفظ مَعَ بمعنی بعد ہے (یعنی جیسے ہر مشکل کے بعد آسانی ہے ایسے ہی ہر قبض کے بعد بسط بھی ہے) تو مولانا رومیؒ کے اس شعر کا مطلب یہ ہوا کہ تم اس کا خیال کر کے شاداں و فرحاں رہو کہ اس کے بعد کسی وقت بسط کی کیفیت بھی طاری ہو گی! یہ تو اجمالی مصلحتوں کا ذکر تھا اور کبھی بعض مصلحتوں کا علم تفصیلی بھی ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے

سالک کی پوری تسلی ہو جاتی ہے، مثلاً کبھی قبض میں یہ مصلحت ہوتی ہے، کہ بعض اوقات سالک پر بسط وانشراح کی حالت میں کسی جدید وارد کے عطا ہونے سے ایک ناز کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے یہ اپنے آپ کو بڑا عابد وزاہد سمجھنے لگتا ہے، اس وقت اگر حق تعالیٰ اس کی دستگیری نہ فرمائیں تو یہ کبر وعجب میں مبتلا ہو کر تباہ وبرباد ہو جائے، اس وقت حق تعالےٰ اس کی دستگیری کی مختلف صورتیں پیدا فرما دیتے ہیں۔

بعض دفعہ قبض طاری فرما کر ذوق وشوق کی کیفیت کو سلب فرما لیتے ہیں اور بعض دفعہ سالک کی اصلاح کے لئے یا اس کو سنبھالنے کی خاطر ذوق وشوق کی کیفیت کو سلب فرما لیتے ہیں تاکہ عجب وکبر میں مبتلا نہ ہو، اس وقت اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ بجائے نازو انداز کے اپنے آپ کو یوں خیال کرتا ہے کہ میں ساری دنیا سے ذلیل ہوں، اس وقت سچ مچ اس کو اپنے سے زیادہ ذلیل وحقیر کوئی منظر نہیں آتا، اور سلوک وتصوف کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ اپنے آپ کو کمتر جانے۔

اہلِ اللہ کے کلام کو سمجھنے کے لئے سلوک سے گذرنا ضروری ہے

یہ بات کسی کی سمجھ میں اُس وقت تک نہیں آسکتی جب تک کہ وہ خود ایسا ہی نہ بن جائے اور نہ ہی اُس وقت تک اہلِ دِل کا کلام سمجھ میں آسکتا ہے۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست

گفتم کہ چو ما شوی بدانی

کسی نے مجھ سے پوچھا کہ عشق کی کیا حقیقت ہے تو میں نے اس سے کہا کہ جب تم ہمارے جیسے ہو جاؤ گے تو تم خود عشق کی حقیقت سے واقف ہو جاؤ گے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ عارف اس وقت تک عارف نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے آپ کو کافر فرنگ سے بدتر نہ سمجھے، اگر کسی پر یہ حالت نہ گذری ہو اور اس کی سمجھ میں نہ آئے تو وہ اس کلام کو انجام ہی کے اعتبار سے سمجھ لے۔ نہ معلوم میرا انجام کیا ہو، ممکن ہے کہ کافر فرنگ کا انجام مجھ سے اچھا ہو، اپنے دل کو یہی سمجھانا چاہیئے کہ انجام معلوم ہونے سے

پہلے مجھے کیا حق ہے کہ اپنے کو کسی سے افضل اور اچھا سمجھوں اور دوسرے کو حقیر۔ گو سب سے بدتر ہونا بھی یقینی نہیں مگر احتمالی تو ہے اور احتمال کی بنا پر اپنے کو افضل خیال کرنا کونسی عقل کی بات ہے اس لئے اپنے آپ کو سب سے بُرا ہی سمجھنا چاہیئے۔ ہاں البتہ یاس و نا امیدی کا درجہ نہ ہونا چاہیئے کیونکہ وہ کفر ہے، کسی نے خوب کہا ہے ؎

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش

ناگاہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

حق تعالےٰ کی رحمت سے نا امید نہ ہو کیونکہ بعض دفعہ (شراب) میں مست رہنے والے رند لوگ اچانک ایک نعرے سے منزل پر پہنچ گئے۔

قبض کی حکمتیں غرض کہ جب بسط میں غلبہ واردات سے ناز کی سی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اسوقت حق تعالیٰ اس پر قبض کی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے اندر عبدیت کے آثار مشاہدہ کرے اور اپنے آپ کو سب سے بدتر سمجھے۔ تو یہ اسکے

حق میں کتنی بڑی رحمت ہے کہ یہ ذریعہ بن گیا ایک عظیم نعمت کے حصول کا۔ اگر قبض کی کیفیت طاری نہ کی جاتی تو بسط میں یہ تباہ ہو جاتا۔

اس کے علاوہ قبض میں ایک مصلحت یہ بھی ہوتی ہے کہ سالک کے لئے انوار بعض دفعہ حجاب بن جاتے ہیں۔ ذکر اللہ کے وقت جو اس پر تجلیات و انوار کا انکشاف ہوتا۔ یہ اسی کی سیر میں مشغول ہو کر اصل مقصد رہ سے رہ جاتا۔ حالانکہ اصل مقصود توجہ الی الحق ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ فرماتے تھے کہ حجاب دو قسم کے ہیں۔ ایک ظلمانی دوسرے نورانی۔ حجاب ظلمانی تو وساوس و خطرات ہیں جو ذکر کے وقت دنیاوی امور کے متعلق قلب میں آیا کرتے ہیں۔ ان پر توجہ کرنا ظاہر ہے کہ مضر ہے، اور حجاب نورانی یہ ہے کہ عالم ملکوت کے انوار و تجلیات منکشف ہوں۔ اور چونکہ وہ بھی ایک عالم ہے جو کہ غیر خدا ہے اس لئے اس کی کیفیات پر توجہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس صورت میں غیر حق کی طرف توجہ لازم آتی ہے جو قابل ترک ہے، اس لئے فرماتے ہیں کہ حجاب نورانی حجاب ظلمانی سے اشد ہیں، کیونکہ اس میں بوجہ نورانیت کے زیادہ مشغولیت ہوتی ہے۔ دوسرے

یہ کہ اس پر اس وقت نئی نئی چیزوں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس کو دیکھ کر سالک اپنے آپ کو کامل سمجھنے لگتا ہے، حالانکہ ابھی تک غیر حق کے ساتھ مشغول اور الجھا ہوا ہے۔ اور وہ انوار و تجلیات اس کے لئے حق کی طرف متوجہ ہونے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ نیز سالک کو ان میں ایک قسم کی لذت بھی محسوس ہوتی ہے حتیٰ کہ اگر وہ کسی وقت محجوب (پوشیدہ) ہو جائیں تو اس کو بڑا رنج ہوتا ہے اس وقت حق تعالیٰ قبض طاری کر کے ان انوار و تجلیات کو سلب فرما لیتے ہیں تاکہ سالک غیر حق سے ہٹ کر اصل مقصود یعنی حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس میں بندہ کے لئے بڑی بڑی مصلحتیں ہوتی ہیں اگر یہ نہ ہو تو سالک اصل مقصود سے رہ جائے سو اگر کسی ذاکر و شاغل کو کسی وقت ایسی حالت پیش آ جائے تو اس وقت گھبرانا نہ چاہیئے بلکہ اس کو حق تعالیٰ کی رحمت سمجھے (اور یہ سمجھے کہ ہو سکتا ہے کہ میرے لئے اسی میں بہتری ہو)

غرض یہ چند مثالیں تفصیلی حکمتوں کی ہیں، ان کے علاوہ اور بھی مصلحتیں قبض میں ہوتی ہیں جو اکثر سالک کو وقت پر خود ہی معلوم

ہوجاتی ہیں. ان اجمالی اور تفصیلی حکمتوں کے استحضار سے قبض میں تسلی ہوجاتی ہے اور قلب میں کچھ شگفتگی پیدا ہوجاتی ہے، ورنہ خود نفسِ قبض تسلی کی چیز نہیں وہ تو موجب غم ہی ہوتا ہے. دراصل تسلی تو جب ہی ہوتی ہے، جب کسی قسم کا بسط وانشراح ہو.

قبض میں گھٹن کی محسوس مثال

معلومات دنیا میں بھی تو یہ بات ظاہر ہے کہ مال ومتاع کا چوری ہوجانا، لٹ جانا. تو موجبِ رنج ہی ہے، یہ اور بات ہے کہ ثوابِ آخرت کو سوچ کر یا مال جانے کے بعد جو حفاظت ونگہداشت سے بے فکری ہوگئی اس راحت کو مستحضر کرکے دل کو سمجھا لیا جائے. مگر نفسِ مال کا چوری ہوجانا ایسی چیز نہیں کہ انسان خود اس پر طبعًا راضی ہوجائے. اس سے تو ایک دفعہ صدمہ ہی ہوگا اور اس کا تصور کرنا بھی موجبِ الم ہوگا، ہاں اس تصور کو چھوڑ دوسری باتوں میں دل کو لگایا جائے تو کچھ تسلی ہوسکتی ہے

اسی طرح قبض بھی بظاہر متاع باطن کا لٹ جانا ہے، اس سے صدمہ اور پریشانی کا ہونا لازمی اور طبعی امر ہے. گو اس کے

مصالح اور منافع کیطرف قلب کو متوجہ کرکے تسلی ہوجائے تو یہ اور بات ہے ورنہ خود نفس قبض پر دل راضی نہیں ہوتا۔ اور نہ یہ اپنی ذات سے تسلی کی شئے ہے، بلکہ جس طرح دنیا میں اصلی تسلی کی چیز یہ ہے کہ روزانہ نئی آمدنی ہوتی رہے اسی طرح باطن میں اصلی تسلی کی چیز بسط ہی ہے۔ یعنی انوار و تجلیاتِ حق کا قلب پر وارد ہوتے رہنا جس میں وقتاً فوقتاً یوماً فیوماً متاع باطن کو ترقی ہوتی رہے۔ اور جدید و لذیذ واردات اور مشاہدۂ حق کا ہر دم ورود ہوتا رہے۔

گناہ اور ناراضی حق تعالیٰ کا خطرہ اور تصور و خیال اور بھی زیادہ پریشان کا سبب ہوتا ہے

یہ بات اس پر چلی تھی کہ کم گناہ کرنے والوں میں جو خاص لوگ ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ گناہ پر تو وہ کیا ہی صبر کر سکتے وہ تو ایک ذرا سے تغیر اور وارد کے فوت ہونے پر ہی پریشان اور بےچین ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ابھی سنا کہ سالکین کی قبض میں کیا حالت ہوتی ہے؟ کسی بادشاہ کی بادشاہت چھن جانے سے بھی وہ بےچین اور پریشانی نہیں ہوتی

جوان حضرات کو اس حالت کے پیش آنے سے ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تھوڑے گناہ کرنے والا بہ نسبت زیادہ گناہ کرنے والوں کے زیادہ پریشان ہوتا ہے اور جس کے پاس بالکل گناہ نہ ہو وہ تو اس سے بھی زیادہ پریشان ہوتا ہے

اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص نے قرض لینا تو کبھی جانا ہی نہیں، بلکہ وہ ہمیشہ اس بات کا عادی ہو کہ اپنے پاس سَو پچاس روپیہ جمع رکھتا ہے، کبھی خالی ہاتھ نہیں رہتا اور ضرورت والوں کو ضرورت کے وقت دیتا دلاتا بھی رہتا ہے. ایسے شخص کا اگر کبھی اتفاق سے ہاتھ خالی ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ اس کو کتنی پریشانی ہوگی تھوڑے مقروض کو وہ پریشانی نہ ہوگی جو اس شخص کو محض اپنا ہاتھ خالی ہو جانے سے ہوگی، کیونکہ جس نے ہمیشہ دوسروں کو دیا ہو، کبھی کسی سے ایک پیسہ کا اُدھار نہ لیا ہو اس کو تو اس کے تصور سے بھی لرزہ آئے گا کہ آج میرا ہاتھ خالی ہے، خدانخواستہ مجھے کسی سے مانگنا نہ پڑے۔

اہلِ اللہ تو احتمالِ گناہ ہی سے کانپ اٹھتے ہیں | اہلِ اللہ کی بھی

یہی حالت ہے کہ گناہ تو کیا؟ وہ تو احتمالِ گناہ سے بھی کانپتے ہیں. حتیٰ کہ واردات کے کم ہو جانے سے گھبراتے ہیں، کیونکہ اس سے کسی قدر تنزل اور بعد کا وہم ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر ایسے خواص سے کبھی کوئی گناہ ہو جائے تو بہ نسبت اوروں کے ان کو زیادہ رنج و ملال ہوتا ہے. کیونکہ ان کو گناہ کے نشتر سے تکلیف کا احساس ہوتا ہے. بخلاف اُن لوگوں کے جو اکثر و بیشتر گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں. توبہ کر کے اجتناب نہیں کرتے ان کا احساس نہایت ضعیف یا مفقود ہو جاتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں گناہ کرنے سے ایک سیاہ نقطہ کا قائم ہو جانا اور مسلسل کرتے رہنے سے پورے دل پر سیاہی کا احاطہ کر لینا مذکور ہے، تو جو لوگ واردات کی کمی سے بھی پریشان ہو جاتے ہیں وہ بھلا گناہ سے کیوں پریشان نہ ہوں گے یہی پریشانی ہے جو سب میں مشترک ہے، البتہ کسیکو اس کا احساس زیادہ ہے کسی کو کم اور جو کسی کو اپنی اس حالت پر احساس نظر اور تاسف بھی نہ ہو تو اس کی یہ حالت خود قابلِ تاسف ہے اول تو گناہوں پر نظر کر کے ہم کو خود رونا چاہیئے اور جو کسی کو

رونا نہ آئے تو اس رونا نہ آنے پر رونا چاہیئے کہ افسوس! میں ایسا سنگدل... ہو گیا ہوں کہ مجھے بدحالی پر رونا بھی نہیں آتا۔

میرے دوستو! اگر کسی کو رونا نہ آئے تو کم از کم رونے کی صورت بنا لینی چاہیئے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَبْکُوْا — اگر رونا نہ آئے تو رونے کی

فَتَبَاکُوْا۔ — شکل ہی بنا لو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تَبَاکِیْ ہی کو بُکَاء کا بدل قرار دیا ہے کیونکہ بکاء عین خود مقصود نہیں بلکہ مقصود بکاء قلب ہے جسے دل کا رونا کہتے ہیں۔ پس تَبَاکِیْ میں گو آنکھ سے رونے کی صورت نہ پائی جائے مگر رونے کی حقیقت تو موجود ہے یعنی دل کا رونا، اور دل کے رونے کی حقیقت ہے فکر و رنج، ملال و تاسف، کہ ہائے مجھ سے ایسا فعل کیوں سرزد ہوا، ندامت و شرمندگی کے ساتھ خدا تعالے کے سامنے گڑگڑانا... بڑی قیمت رکھتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

اے خوشا چشمے کہ آں گریانِ اوست

اے خوشا آں دِل کہ او بریانِ اوست

وہ آنکھ کتنی اچھی ہے جو محبوب کی یاد میں روتی ہے اور وہ دِل کتنا اچھا ہے جو محبوب کے صدمۂ فراق میں کباب کی طرح بھنا ہوا ہے صاجوا صل مقصود دِل کا رونا ہے، نہ کہ آنکھ کا رونا۔ ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے وعظ فرمایا، حاضرینِ مجلس نے آپ کے وعظ کے اثر سے کپڑے پھاڑنے شروع کر دیئے، آپ نے ارشاد فرمایا۔

لَا تَشُقُّوْا جُیُوْبَکُمْ — یعنی گریبان چاک نہ کرو بلکہ

شَقُّوْا قُلُوْبَکُمْ۔ — دلوں کو چاک کرو،

اس کے یہ معنی نہیں کہ گریبان چاک کرنے والے قابلِ ملامت ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل مقصود دِل کا چاک کرنا ہے۔ اس میں کوشش اور سعی کرنی چاہیئے۔ اور گریبان چاک کرنے والوں پر طعن نہ کرنا چاہیئے۔ شیخ سعدیؒ جن کا لقب تاج الاولیا ہے، فرماتے ہیں ؎

مکن عیب درویش حیران ومست

کہ غرق ہست ازاں می زند پا و دست

بزرگوں کی ظاہری بڑائی دیکھ کر حیران نہ ہو، وہ محبت خداوندی کے عشق میں غرق ہونے کی وجہ سے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں؟ اس میں تعلیم ہے کہ ان پر اعتراض نہ کرو، آگے ان کا عذر ظاہر کرتے ہیں ؎

بہ تسلیم سر در گریباں برند
چوں طاقت نماند گریباں درند

خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر گریبان میں سر ڈالے رہتے ہیں، جب برداشت کی طاقت نہیں رہتی تو گریبان پھاڑتے ہیں۔

کامل کو ضبطِ کیفیات پر پوری قدرت ہوتی ہے

کامل بظاہر ساکن معلوم ہوتا ہے، مگر درحقیقت وہ بہت تیز جارہا ہے۔ ذرا سی دیر میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ البتہ اتفاقیہ طور پر جوش و ولولہ کے حالات پیش آنا مثلاً کپڑے پھاڑنا۔ بے ہوش ہوجانا یا زار و قطار رونا وغیرہ کمال کے منافی نہیں، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر بے ہوش ہوگئے تھے۔

حضرات صحابہ کرامؓ سے زیادہ صاحب کمال اور انوار باطنیہ سے مالا مال کون ہوگا؟

حضرات صحابہؓ میں جو سب سے زیادہ مضبوط اور مستقل مزاج تھے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثہ وصال پر جو کہ مسلمان کے لئے کچھ کم ہیبتناک نہ تھا۔ بجز آنسو بہانے اور رونے کے کچھ نہیں کیا۔ حضرات صحابہ کرامؓ اس عظیم حادثہ پر جتنا بھی آہ و بکا یا گریبان چاک کرتے تھوڑا تھا۔ مگر کچھ نہیں کیا۔ اور ان حضرات میں جو تھوڑا بہت تغیر ہو بھی گیا تھا۔ وہ بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیان کے بعد سب جاتا رہا اور تمام صحابہؓ کرام دین کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ غرض یہ بات تو تمام صحابہ کرامؓ میں مشترک تھی کہ وہ کبھی حالات و کیفیات سے مغلوب نہ ہوتے تھے۔ اس لئے نہ وہ کبھی وجد میں رقص کرتے تھے۔ اور نہ کپڑے پھاڑتے تھے چونکہ کامل کو ضبط کیفیات پر پوری قدرت ہوتی ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق ردولوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ

منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد اینجا مردانند

کہ دریاہا فرو برند و آروغ نمی زنند.

حضرت منصورؒ بچے تھے کہ ایک قطرہ میں پکار اٹھے. یہاں مرد ہیں (مراد عالی ہمت) کہ معرفتِ الٰہی کے سمندر پی جاتے ہیں مگر ڈکار تک نہیں لیتے ـــــ

ان حضرات کا دریا وجد یا رقص یا شطحؔ کی راہ سے نہیں بہتا، البتہ ان کا دریا دوسری راہ سے بہتا ہے، یعنی افادات اور نفع رسانی کی راہ سے، وہ اپنے جوش و خروش کو طالبین کی توجہ میں صرف کرتے ہیں جس سے ہزارہا مخلوق درجہ ولایت پر پہنچ جاتی ہے. اگر کبھی بہت ہی غلبہ ہوا. تو ان کا دریا آنکھوں کی راہ سے کسی وقت بہہ نکلتا ہے. چنانچہ کہتے ہیں ؎

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں
یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

اے اللہ، چشمۂ محبت کیسا چشمہ ہے کہ اس کا میں نے ایک قطرہ پیا

ؔ وہ بات جو غلبہ حال میں زبان سے نکل جائے، جس میں ظاہر الفاظ کچھ ہوتے ہیں، اور منشا کچھ اور ہوتا ہے۔ مرتب غفرلہ

جو آنسوؤں کا دریا بن گیا۔

یہ حضرات بڑے عالی ظرف ہوتے ہیں۔ بہت ضبط کرتے ہیں اگر کبھی پوری طرح ضبط نہ ہو سکا تو آنکھوں سے آنسو بہا لیتے ہیں یا کسی دوسرے طریق سے اس کا اظہار اتفاقاً ہو جاتا ہے اور یہ کوئی نقص نہیں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بعض دفعہ روتے تھے، اور آپ کے سینہ مبارک سے ایسی آواز سنائی دیتی تھی جیسے ہنڈیا پک رہی ہو۔

صاحبِ حال معذور ہے

غرض چیخنا، چلانا، کپڑے پھاڑنا اور رقص کرنا کوئی کمال نہیں، یہ محض حالات ہیں، اور حالات بھی ایسے جو نہ مطلوب نہ مذموم، کیونکہ حالات مطلوبہ تو وہی ہیں۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے مشابہ ہوں، اور یہ بات یاد رکھیئے کہ حضورؐ کے حالات کے ساتھ جتنی زیادہ مشابہت ہوگی اتنا ہی زیادہ کمال ہوگا۔ اسی لئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اصل مقصود دِل کا رونا ہے۔ نہ کہ آنکھوں سے صرف آنسو بہا دینا۔ لیکن یہ رونیکی

صورت بنا لینا بھی فائدہ سے خالی نہیں، اس سے بھی بعض دفعہ کام بن جاتا ہے۔ اگر آنکھوں سے ہی رونا مقصود ہوتا تو رونے کی کوشش کو اس کے قائم مقام نہ قرار دیا جاتا۔ اور یہ نہ ارشاد فرماتے۔

فَاِنْ لَّمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكُوْا — اگر رونا نہ آئے تو دکم از کم رونے کی سی صورت ہی بنالی جائے۔

ہماری حالت قابلِ اصلاح ہے

بہرحال ہم لوگوں کی حالت ضرور قابلِ اصلاح ہے اور جو لوگ گناہوں میں مبتلا ہیں گو کمی کے ساتھ ہوں ان کو بھی اس حالت پر تاسف ہونا چاہیئے۔ اور جن کو تاسف نہ ہو اُن کو اُس تاسف نہ ہونے پر تاسف ہونا چاہیئے، اور یہ حالت زیادہ خطرناک ہے، خصوصاً جب کہ یاددہانی بھی کرائی جائے بعض دفعہ خود اپنی حالت پر تاسف نہیں ہوتا مگر دوسرے کی تنبیہ سے خیال پیدا ہو جاتا ہے، یہ غنیمت ہے، جن لوگوں کو اپنی بدحالی پر تاسف نہیں ہے وہ بھی اپنی بدحالی کے مُقر تو ضرور ہیں کہ گنہگار ہونے کا ہر شخص کو اقرار ہے اس سے معلوم ہوا کہ مرض کا احساس تو سب کو ہے

مگر کوتاہی یہ ہے کہ علاج کی فکر نہیں، اور ظاہر ہے کہ مرض کا علاج نہ کرنا سخت خطرناک ہے، اس لئے علاج کی طرف توجہ کرنا ضروری ہوا،

آمدم برسرِ مطلب

مذکورہ آیت کو اختیار کرنے کی وجہ پس اس وقت جس آیت کو میں نے تلاوت کیا ہے

اس میں اسی مرض عام کا علاج موجود ہے۔ ارشاد ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

ان جیسے مت بنو جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا پس اللہ تعالیٰ نے (بھی) خود ان کی جانوں سے ان کو بے پروا بنا دیا (اور) یہی لوگ نافرمان ہیں۔

سبحان اللہ! حق تعالیٰ اپنے بندوں کا کتنا لحاظ فرماتے ہیں یوں نہیں فرمایا کہ "ان لوگوں میں سے نہ ہونا جو اللہ کو بھول گئے" کیونکہ آیت کے مخاطب مسلمان ہیں اور مسلمان کی شان سے یہ بعید

ہے کہ وہ خدا کو بھول جائے۔

اِس لئے یوں فرمایا کہ "دیکھو بھولنے والوں کے مشابہ نہ ہوجانا۔ اس عنوان میں جسقدر لطف وعنایت ہے وہ ظاہر ہے، کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خدا تعالےٰ کو بھول جانا تو تمہاری محبت سے بعید ہے۔ ہاں بھولنے والوں کی طرح ہوسکتے ہو۔ تو دیکھو۔ ہم تم سے کہتے ہیں کہ تم ایسے بھی نہ ہونا۔

دوسرے اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خدا کا بالکل بھولنے والا کافر ہے اور آیت کے مخاطب مسلمان ہیں۔ اور مسلمان کافر نہیں ہوسکتا اس لئے مسلمانوں کو

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الَّذِينَ — کہ تم ان لوگوں میں سے مت
نَسُوا اللّٰهَ — ہوجانا جنہوں نے اللہ کو بہلادیا

کے ساتھ خطاب ہو بھی نہیں سکتا بلکہ ان کو تو

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ — تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا
نَسُوا اللّٰهَ — جنہوں نے اللہ کو بھلادیا

سے ہی خطاب ہوسکتا ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے

تھے کہ جو شخص ایک مرتبہ مسلمان ہو گیا وہ پھر کبھی کافر نہیں ہو سکتا اور یہ جو بعضے مسلمان آریہ، عیسائی وغیرہ ہو جاتے ہیں۔ وہ حقیقت میں مسلمان ہی نہ تھے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، ایک شخص ظاہر میں مدعیِ اسلام ہو اور دل میں ایمان نہ ہو، تو محض زبانی دعوے سے دل میں ایمان کا ہونا لازمی نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک مدعی اسلام عند اللہ مسلمان نہ ہو۔

بعض دفعہ قلبی کیفیت اور زبانی تحکم سلبِ ایمان کا سبب ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس وقت بھی اپنے آپ کو مسلمان ہی خیال کرتا ہے۔ حالانکہ وہ عند اللہ مومن نہیں ہوتا۔

ایک عبرتناک واقعہ

چنانچہ میں ایک عجیب وغریب اور حیرت انگیز واقعہ سناتا ہوں۔ جس کو میں نے خود اپنے حضرت والاؒ سے سنا تھا۔ فرماتے تھے کہ شیخ دھان جو مکہ معظمہ میں ایک بڑے عالم تھے انہوں نے بیان کیا کہ مکہ معظمہ میں ایک مسلمان عالم کا انتقال ہوا۔ ان کو دفن کر دیا گیا۔ کچھ تھوڑے سے عرصے بعد ایک اور شخص کا انتقال ہوا۔ اس کے وارثوں نے یہ چاہا

ؒ یعنی حکیم الامۃ حضرت تھانوی رحؒ

کہ اس کو بھی اُسی عالم کی قبر میں دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ اُن کے حسب
خواہش جب اُس عالم کی قبر کھودی گئی تو دیکھا اس عالم کی لاش
کی بجائے ایک حسین جمیل لڑکی کی لاش رکھی ہوئی ہے۔ دیکھنے سے وہ لڑکی
یورپین معلوم ہوتی تھی، سب کو حیرت ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اتفاق
سے اُسی مجمع میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس نے لڑکی کی صورت دیکھ کر
کہا کہ میں اس کو پہچانتا ہوں یہ لڑکی فرانس کی رہنے والی ہے، ایک
عیسائی کی بیٹی ہے، یہ مجھ سے اردو پڑھتی تھی اور در پردہ مسلمان
ہوگئی تھی اور اس کو میں نے دینیات کے رسائل بھی پڑھائے تھے
لوگوں نے کہا کہ اس کے یہاں منتقل ہونے کی وجہ تو معلوم ہو گئی،
کہ وہ مسلمان اور نیک تھی، مگر اس مسلمان عالم کی لاش کہاں گئی۔ اس
پر لوگوں نے اس شخص سے کہا کہ جب تم حج سے فارغ ہو کر یورپ
جاؤ تو اس لڑکی کی قبر کھود کر دیکھنا کہ اس میں اس مسلمان عالم کی
لاش ہے یا نہیں اور ایک صورت شناس کو بھی ساتھ کر دیا، چنانچہ
اس شخص نے یورپ واپس آکر اُس کے والدین سے لڑکی کا حال بیان
کیا، اس واقعہ کو سن کر ان کو بڑی حیرت ہوئی۔ بالآخر یہ رائے ہوئی

کہ اس لڑکی کی قبر کھودی جائے چنانچہ قبر کھودی گئی تو واقعی اس کے
تابوت میں اس کی لاش نہ تھی بلکہ اس کے بجائے وہی مسلمان عالم
رکھے ہوئے نظر آئے، جب اس واقعہ کی اطلاع مکہ معظمہ والوں کو
پہنچی تو ان لوگوں کو فکر ہوئی کہ اس شخص کی لاش مکہ معظمہ سے کفرستان
کس سبب سے منتقل ہوئی؟ سب نے کہا کہ اس کی بیوی سے پوچھنا
چاہیئے کہ اس کا ایسا کونسا کردار تھا جس کی بنا پر اس کے ساتھ یہ
معاملہ کیا گیا۔ کیونکہ اس کے صحیح حالات کا اندازہ بیوی سے ہی ہوسکے
گا۔ چنانچہ لوگ اس کے مکان پر پہنچے اور دریافت کیا کہ کیا تیرے شوہر
میں اسلام کے خلاف کوئی بات تھی؟ اس نے کہا کہ وہ تو بڑے
نمازی اور قرآن پاک کی تلاوت کرنے والے اور تہجد گزار تھے۔ لوگوں
نے اس سے کہا کہ ذرا سوچ کر بتلاؤ کیونکہ اس کی لاش مکہ معظمہ میں
دفن کرنے کے بعد فرانس کفرستان پہنچ گئی ہے، کوئی بات اسلام
کے خلاف ضرور تھی، جو اس کی لاش کو کفرستان لے گئی۔ اس پر اس
کی بیوی نے کہا کہ اور تو مجھ کو کچھ معلوم نہیں، البتہ اتنا معلوم ہے
کہ جب وہ مجھ سے فراغت کے بعد غسل کا ارادہ کرتے تو یوں کہا کرتے

تھے کہ نصاریٰ کے مذہب میں یہ بات بڑی اچھی ہے کہ ان کے یہاں
غسلِ جنابت فرض نہیں لوگوں نے کہا بس یہی بات ہے جس کی وجہ سے
اللہ تعالیٰ نے اس کی لاش کو اسی قوم (نصاریٰ) کی جگہ پھینک
دی جن کے طریقہ کو وہ پسند کرتا تھا۔

دیکھا آپ نے کہ یہ شخص اگرچہ ظاہر میں نیک اور پورا مسلمان
معلوم ہوتا تھا، مگر تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں ایک بات
کفر کی بھی تھی کہ وہ کفار کے ایک طریقہ کو اسلامی حکم پر ترجیح دیتا
تھا اور چونکہ استحسانِ کفر کفر ہے (یعنی کفر کو اچھا سمجھنا بھی کفر ہے)
اس لئے وہ شخص پہلے ہی سے مسلمان نہ تھا، اور یہ ضروری نہیں کہ
ہر جگہ لاش منتقل ہو جایا کرے۔ اللہ تعالیٰ کبھی ایسا بھی کر کے دکھا
دیتے ہیں۔ تاکہ لوگ اس سے عبرت پکڑیں۔ اور سمجھیں کہ بدحالی
کا نتیجہ یہ ہوتا ہے اسی لئے شیطان کے بارے میں ارشاد
ہے

وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ — کہ وہ پہلے ہی سے کافروں میں تھا
یہ نہیں کہ پہلے فرشتہ تھا بعد میں کافر ہو گیا۔ جیسا کہ عوام میں

مشہور ہے، بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے سے اس کے
کفر کا اظہار ہوا۔ شیطان لوحِ محفوظ میں دیکھ کر اس سے باخبر تھا
کہ ایک شخص کافر ہونے والا ہے، مگر وہ اپنی طاعت و زہد کی وجہ
سے اپنے سے بے فکر تھا کہ میں اتنا عبادت گذار ہو کر کافر ہو سکتا ہوں؟
یہ اور کوئی شخص ہوگا، تو شیطان بھی اسی تکبر اور بے فکری ہی کے
سبب تباہ اور برباد ہوا۔ بخلاف ملائکہ کے کہ جب ان کو اس کا علم ہوا۔
تو وہ سب کے سب پریشان اور فکر مند ہوگئے کہ دیکھئے ہم میں سے کسی
کی کمبختی نہ آجائے، وہ اس فکر اور تواضع کی وجہ سے مقبول و محترم
رہے اور شیطان پہلے ہی سے مقبول نہ تھا اس لئے مردود ہو گیا۔ ورنہ
جو ایک مرتبہ مقبول ہو جاتا ہے وہ پھر کبھی مردود نہیں ہوتا۔ جیسے
ایک شخص بالغ ہو کر پھر نابالغ نہیں ہوتا ایسے ہی جسنے صدقِ دل
سے ایک مرتبہ اسلام قبول کر لیا۔ پھر وہ کافر نہیں ہوتا جس نے مسلمان
ہونے کے بعد حکمِ الٰہی کے سامنے اپنی ہوا و ہوس کو فنا کر دیا ہو وہ
بالغ ہے اور جس نے اپنی نفسانی خواہشات کو ختم نہیں کیا اور ان کو
اپنے اوپر غالب رکھا وہ نابالغ ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

خلق اطفالند جز مست خدا
نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا!

ساری مخلوق بچوں کی طرح ہے، سوائے اس شخص کے جو حق تعالےٰ کا مست ہوگیا، بس بالغ وہی ہے جو ہوائے نفسانی سے چھوٹ گیا۔

واقعی ایمان کی یہی شان ہے کہ وہ جب قلوب میں پیوست ہوجاتا ہے تو پھر نکالے نہیں نکلتا۔ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت سفیان ابن حربؓ سے اسلام لانے سے قبل روم کے شاہ ہرقل نے سوال کیا کہ کیا کوئی شخص اس دین اسلام کے اختیار کرنے کے بعد کراہت کے ساتھ اس کو چھوڑتا بھی ہے؟ آپ نے جواب میں کہا کہ نہیں اس پر ہرقل نے کہا:۔

كَذَالِكَ الْاِيْمَانُ حِيْنَ تُخَالِطُ بَشَاشَتُهُ الْقُلُوْبَ۔

ایمان کی یہی حالت ہے قلوب میں پیوست اور راسخ ہونے کے بعد نہیں نکلتا،

کیونکہ ایمان کی مثال عشق جیسی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ — البقرہ: ۲۱ رکوع

جو مومن ہیں ان کو اللہ تعالٰی کے ساتھ نہایت (درجہ) قوی محبت ہے،

یہاں پر ایمان بمعنی عشق ہے، اگر وہ عشق سچا ہوگا تو کبھی دل سے نہیں نکلے گا، اور یہی حال ایمان کا ہے۔ اسی لئے اہل اللہ اور خاصانِ حق اپنے دل میں کسی جائز محبت کو بھی جگہ نہیں دیتے تا کہ موت کیوقت اس فانی محبوب کا خیال نہ آجائے ان کا اصل مدعٰی تو یہ ہے کہ جب دنیا سے رخصت ہوں تو اس وقت سوائے خدا اور رسول کی محبت کے کوئی اور محبت دل میں نہ ہو، اسی وجہ سے اہلِ اللہ جائز محبت سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ ہم اگر جائز محبت سے (جو غلبہ کے درجہ میں ہو) اجتناب نہ کرسکیں تو کم از کم حرام محبت سے تو ضرور بچیں، اگر غور کیا جائے تو سمجھ میں آجائے گا کہ جینا اور مرنا نہیں حضرات اہل اللہ کا ہے۔ اگر ہم بھی ان ہی جیسی زندگی اور موت چاہتے ہیں تو ان کے ساتھ وابستہ ہوجائیں، انشاء اللہ ہم کو بھی ایک دن یہی دولت نصیب ہوجائے گی۔

پس اس آیت میں (جس کی ابتداء میں تلاوت کی ہے) تشبیہ اختیار کرنے کے دوسرے نکتہ کا حاصل یہ نکلا کہ چونکہ اس ارشاد باری تعالیٰ کے مخاطب مسلمان ہیں اس لئے وَلَا تَكُونُوا مِنَ الَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ ــــــ کا خطاب مسلمانوں کو تو ہو نہیں سکتا کیونکہ مسلمان کبھی خدا تعالےٰ کو دل سے نہیں بھلا سکتا، اس لئے اللہ تعالےٰ نے وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فرمایا کہ بالکل بھول جانا یہ تو کافروں کا کام ہے۔

آگے ارشاد ہے۔

فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ جب وہ خدا تعالیٰ کو بھول گئے تو خدا تعالےٰ نے بھی ان کو بھلا دیا۔

اس ارشاد میں ایک نکتہ کی طرف اشارہ ہے مگر اس نکتہ کو سمجھنے سے پہلے ایک بات سمجھ لیجئے، وہ یہ ہے کہ ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ سورہ ق: پارہ ۲۶ ہم انسان کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اب اگر انسان اس کے بعد بھی خدا کو بھول جائے جو کہ انسان کی رگ سے بھی زیادہ قریب ہے تو ممکن نہیں کہ وہ اپنے کو یاد رکھے اس سے معلوم ہوا کہ خدا کو بھولنے والا درحقیقت خود کو بھولا ہوا ہے. اور جو خدا تعالے کو یاد رکھے گا وہ اپنے کو بھی یاد رکھے گا مگر مستقلاً نہیں بلکہ اس طرح کہ میں خدا کی چیز ہوں خدا تعالے کے ساتھ مجھے تعلق ہے جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب خدا کی امانت ہے وہ کسی چیز کو بلا واسطہ خدا یاد نہیں کرے گا، جیسے عاشق کو محبوب کی چیزیں یاد رہتی ہیں اور ان کی یاد حقیقت میں محبوب ہی کی یاد ہوتی ہے اسی طرح وہ اپنے کو اور اپنے متعلقات کو بھی سمجھتا ہے کہ یہ سب محبوب کی چیزیں ہیں.

اہلِ دنیا اور اہلِ اللہ میں فرق

اہل اللہ اپنی ذات یا اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنے تمام متعلقات کی حفاظت نوکر کی طرح کرتے ہیں مالک کی طرح نہیں کرتے. ہم تو کھاتے ہیں اپنا پیٹ بھرنے

کے لئے، اور وہ کھاتے ہیں سرکاری مشین کی حفاظت کے لئے،

یہاں سے اس ارشاد باری تعالےٰ

لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ — مت قتل کرو اپنے نفسوں کو

کا راز بھی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ خودکشی کیوں ممنوع ہے۔ یہ آپ کی جان نہیں کہ جیسا چاہیں تصرف کریں۔ نہیں بلکہ یہ بھی ان ہی کی ملک ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی چیز میں بلا اجازت تصرف کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اسی مرتبہ میں حکم ہے کہ

اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَ
اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَ
اِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا

تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، اور تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے، اور تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے،

اسی لئے کسی کو یہ حق نہیں کہ ٹھنڈی دوا کھاکر نامرد ہو جائے یا آنکھوں میں گرم سلائی پھیر کر اندھا ہو جائے، اسی لئے عارفین اور اہل اللہ اپنی جان کو سرکاری چیز سمجھ کر اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ ظاہر بین اپنے پر قیاس کرکے اس کو تن پروری

سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ اس سے کوسوں دور ہیں ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا ہے

۵ درنیابد حال پختہ ہیچ خام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

خام کاروں (ناواقفوں) کو پختہ کاروں (عارفوں) کا حال معلوم نہیں ہوسکتا اس لئے یہاں گفتگو کا مختصر رکھنا ہی بہتر ہے۔

عام لوگ تو ٹھنڈا پانی اس لئے پیتے ہیں کہ مزہ آئے گا۔ پیاس کو تسکین ہوگی۔ طبیعت کو بشاشت ہوگی۔ اور عارف اسلئے پیتا ہے کہ ہر بن موسے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا ہو اور اس کی حمد ہو

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا
(دیکھو! راستہ کا فرق، کہاں سے کہاں تک ہے)

واقعی ہم اپنے نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ کے ہیں تو جو خدا کو یاد کرے گا وہ اپنے کو بھی یاد رکھے گا، اور اپنا یاد رکھنا اس طرح پر ہوگا کہ اول اس کی نظر خدا تعالےٰ پر پڑے گی، پھر اپنے پر،

اور یہ توجہ الی الغیر نہیں جو ممنوع ہو، اس کو یوں سمجھئے کہ جیسے ایک حسین شخص کی صورت آئینہ میں نظر آرہی ہو، اور ایک عاشق بھی وہاں بیٹھا ہوا ہو جو اس محبوب کی طرف رعب وجمال کیوجہ سے نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا اس لئے وہ آئینہ میں اس کی صورت دیکھ رہا ہے۔ اور ایک دوسرا شخص ہے جو عاشق نہیں وہ بھی اس آئینہ کو دیکھ رہا ہے مگر اس نیت سے، کہ دیکھوں آئینہ کیسا ہے؟ تو یہ دونوں شخص بظاہر آئینہ دیکھنے میں یکساں ہیں، مگر دونوں کے دیکھنے میں زمین وآسمان کا فرق ہے، عاشق کی نظر اول محبوب کی طرف پڑے گی گو تبعاً آئینہ پر بھی نظر پڑ جائے گی، اور غیر عاشق کی نظر اولاً آئینہ پر پڑے گی گو تبعاً حسین کی تصویر پر بھی نظر جائے گی، مگر اس کا مقصد حسین کی تصویر دیکھنا نہیں صرف آئینہ کی خوبی دیکھنا مقصود ہے بعینہ یہی فرق اہل اللہ اور غیر اہل اللہ میں ہے، کہ مخلوقات کی طرف ان کی نظر یں بظاہر یکساں ہیں مگر حقیقت میں بڑا فرق ہے۔ اہل اللہ کی نظر اولاً خدا کی طرف پڑتی ہے پھر تبعاً مخلوق بھی اس کے سامنے آجاتی

ہے اور ہماری نظر اولاً مخلوق پر ہوتی ہے گو ضمناً حق تعالیٰ کی صنعت اور قدرت کا بھی خیال آجاتا ہے۔

خدا قریب ہے نفس دور ہے لہذا خدا سے غفلت خود اپنے سے غفلت ہے

غرض جب یہ ثابت ہو گیا کہ عاشق اور اللہ والے کی نظر اوّل خدا کی طرف پڑتی ہے اور بعد میں اپنے پر، تو معلوم ہوا کہ خدا بہ نسبت نفس کے زیادہ قریب ہے، اگر خدا تعالیٰ نفس سے قریب نہ ہوتے تو کسی کی نظر بھی اولاً ان کی طرف نہ پڑتی، پس ثابت ہوا کہ جو خدا کو بھول گیا وہ اپنے نفس کو بھی بھول گیا، پس اسی چیز کو فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ میں بیان فرمایا ہے

آگے فرماتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ — یہ لوگ ہیں حکم سے نکل جانیوالے،

اس وقت بیان سے یہی جز مقصود ہے جس سے اس بدحالی کا جس کو اب تک بیان کیا گیا ہے علاج بیان کرنا ہے اُولٰٓئِكَ میں اسم اشارہ ہے جس کے لئے فَاسِقُوْنَ کا حکم ثابت کیا گیا ہے اور بلاغت

کا قاعدہ ہے کہ اسم اشارہ میں مشارٌ الیہ کا صفات مذکورہ کے ساتھ اعادہ ہوتا ہے اور حکم کی بنا انہیں صفات پر ہوتی ہے جو پہلے مذکور ہوتی ہیں چنانچہ علمار مفسرین نے اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ	بس یہی لوگ ہیں ٹھیک راہ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○	پر (چلنے والے) جو ان کے پرور
	دگار کی طرف سے ملی ہے اور

یہی لوگ ہیں پورے کامیاب ،

کی تفسیر میں تصریح کی ہے کہ یہاں اسم اشارہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جیسے ہدایت اور فلاح کا حکم اس سے پہلے جن صفات (ایمان بالغیب اقامتہ صلوٰۃ ، تصدیق کتب سماوی اور انفاق مال وغیرہ) پر موقوف ہے اور ان صفات کو فلاح میں دخل ہے. ٹھیک اسی طرح یہاں اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ میں بھی صفت نسیان کا اعادہ ہے جو پہلے اَلَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ میں مذکور ہو چکی ہے، تو حکم فسق کی بناء اسی صفت پر ہو گی جس کا حاصل

یہ نکلا کہ آیت میں فسق کو نسیانِ خدا پر مرتب کیا ہے کہ دراصل فاسق اور احکام سے نکل جانے والے وہی لوگ ہیں جو خدا کو بھول گئے تو خدا کو بھول جانا ہی فسق کا سبب ہے،

فسق کی حقیقت کیونکہ فسق کے معنی حکم سے نکل جانے کے ہیں" اور حکم سے نکل جانا ہی حقیقت ہے معصیت کی جس میں ہم مبتلا ہیں، الحمد للہ اس آیت سے صاف طور سے مرض کا اصلی سبب معلوم ہوگیا کہ ہماری بدحالی کا حقیقی سبب خدا تعالےٰ کو بھول جانا ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ العلاج بالضد علاج ضد کے ساتھ ہوتا ہے، اگر مرض کا سبب سردی ہے تو اس کا علاج گرم ادویہ سے کیا جاتا ہے، اسی طرح اس کا عکس ہے کہ اگر مرض کی وجہ گرمی ہے تو اس کا علاج سرد ادویہ سے کیا جاتا ہے، اسی طرح یہاں بھی علاج بالضد ہونا چاہئے کہ اگر بدحالی کیوجہ نسیان ہے (یعنی بھولنا) تو اس کی ضد یاد ہوئی تو گناہوں کا اصل علاج جس کا سبب خدا کو بھولنا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی یاد ہے۔ یا یوں کہئے کہ ہر مرض کا علاج سبب کے رفع ہونے کے ساتھ

ہوتاہے خواہ ضد کے ذریعہ سے رفع کیا جائے یا مثل کے ذریعہ بہر
حال ازالہ مرض کے لئے رفع سبب، سب کے نزدیک ضروری ہے اور
جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ مرضِ عصیان کا سبب نسیان ہے، تو
اس کا علاج یہ ہوا کہ نسیان کو رفع کیا جائے. اور رفع نسیان
لازم ہے ذکر اللہ کو، کیونکہ ارتفاع نقیضین دکہ رفع نسیان اور
ذکر دونوں نہ ہوں یہ بات سب کے نزدیک) محال ہے،
تو حاصل یہ نکلا کہ معصیت کا علاج یاد الٰہی ہے،

خدا تعالیٰ کو یاد رکھنے کے طریقے

اب رہی یہ بات کہ
خدا تعالےٰ کی یاد
کیسے ہو اور اس کا کیا طریقہ ہے، تو یاد کے بہت سے طریقے
ہیں، مثلاً ایک یاد ہوتی ہے، محبت کی بنا پر ایک ہوتی ہے
خوف سے، اور ایک ہوتی ہے حیا سے، پھر ان کی بھی چند
قسمیں ہیں کہ اس محبت کا منشار اس کی ذات ہے، یا اس سے
مقصد ثواب ہے، اسی طرح خوف کا حال ہے کہ خوف ذات کا ہے
یا عقاب کا، اور یہی حال حیار کا ہے کہ وہ ذات سے ہے یا محسن

کے احسانات سے۔ اس میں لوگوں کے طبائع اور مذاق مختلف ہوتے ہیں، بعضے ایسے ہوتے ہیں جن میں محبتِ ذات غالب ہوتی ہے۔ یعنی محبوب کی ذات ہی ایسی عظیم الشان ہے کہ مجبوراً اس سے محبت کرنی پڑتی ہے، نہ وہ جنت کے حاصل کرنے کیلئے ذکر اور عبادت کرتے ہیں اور نہ دوزخ سے بچنے کے لئے، صرف ذاتِ حق کا عشق اُن کے لئے ذکر کا باعث بنا ہوا ہے،

اور بعضے وہ ہیں جن کے ذکر اللہ کا منشا، حصولِ جنت ہے ہم کو اس عمل سے جنت ملے گی، دوزخ سے نجات ہوگی، اس میں بھی کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ مقصود تو ذکر اللہ ہے وہ ہونا چاہیئے۔ اگر اسی نیت سے ذکر کرتا رہا تو انشاء اللہ تعالےٰ ایک دن وہ بھی آئے گا کہ اس کو ذاتِ حق سے عشق ہوجائیگا۔ پھر اس کو بھی ذات محبوب کی رضا کے سوا کچھ مطلوب نہ ہوگا۔

مثال کے ذریعہ وضاحت

اس کو یوں سمجھئے کہ پڑھنے والے، لڑکے دو طرح

کے ہوتے ہیں، ایک تو ایسا ہے جس کو خود تعلیم میں لطف آتا ہے اور بغیر کسی حرص وطمع کے تعلیم میں مشغول ہے، دوسرا وہ جو باپ کے اس کہنے سے پڑھتا ہے کہ پڑھتے رہو گے تو ہم تمکو ہر روز ایک آنہ دیا کریں گے، اس کی یہ حالت پہلے سے کم درجہ کی ہی مگر کیا کوئی عاقل اس سے یہ کہہ سکتا ہو کہ میاں پڑھنا ہو تو خود ذاتی شوق سے پڑھو ورنہ ایک آنہ کے لالچ سے پڑھنا کوئی پڑھنا ہے۔ اس سے کیا فائدہ۔ ایسی بات ہرگز کوئی نہیں کہہ سکتا، کیونکہ اس کا نتیجہ بجز محرومی علم کے اور کچھ نہیں بلکہ ہر شخص یہی کہے گا کہ میاں! جس طرح بھی ہو پڑھنا چاہیئے چنانچہ اسی طرح پڑھنے میں لگے رہنے سے ایک دن اس کو ایسا شوق پیدا ہو گا کہ اگر باپ کچھ بھی نہ دے بلکہ یہ کہے کہ پڑھنا چھوڑ دو تب بھی وہ اس بات کی ہرگز نہ مانے گا.

ذکر مطلوب ہے خواہ عشق ذات کی بناء پر ہو یا محبت ثواب کی بناء پر

یہی قاعدہ ذکر میں کیوں روا نہیں رکھا جاتا؟ اور جو لوگ ثواب کے لیے یا حصولِ جنت کے لیے عمل کرتے ہیں ان پر بعض

غیر محققین کیوں اعتراض کرتے ہیں، اور پھر جبکہ خدا تعالے نے خود جنت کی رغبت دلائی ہے بلکہ اس میں رغبت کرنے کا امر بھی کیا ہے تو پھر کوئی وجہ اعتراض کی نہیں۔

چنانچہ ارشاد ہے۔

سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ سورۂ حدید

(تم کو چاہیئے کہ) تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو اور (نیز) ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے

(پ ۲۷ سورۂ حدید۔ آیت ۲۰)

پس جنت کے حصول کی نیت سے عمل کرنے کو جو بعض معترض ایک گھٹیا اور ادنیٰ قسم کی حالت بتاتے ہیں وہ گویا خدا تعالیٰ پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے گھٹیا حالت کی کیوں ترغیب دی ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، حق تعالیٰ نے جتنے بھی طریقے تعلیم فرمائے ہیں وہ سب عمدہ اور اعلیٰ ہی ہیں۔ گھٹیا کوئی نہیں، یہ بات اور ہے کہ ایک حالت رفیع اور

دوسری ارفع ہو مگر محمود دونوں ہیں، محض رضائے محبوب کے لئے ذکر کرنا مقام ارفع ہے مگر طلب جنت کی نیت سے ذکر کرنا بھی رفیع حالت سے کم نہیں بلکہ اس نیت سے ذکر کرنا کہ جنت ملے گی اور جنت کا سوال اس نیت سے کرنا کہ وہ خدا کی چیز ہے. خدا کی رضا کے ثمرے میں دیدار کی جگہ ہے. اور اس کے مانگنے کا حکم فرمایا ہے. اور خود ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سوال کیا ہے تو اس اعتبار سے وہ بھی مقام ارفع ہی ہے۔

چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے کہ

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُکَ الْجَنَّۃَ	حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد
وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیْھَا مِنْ	فرماتے ہیں کہ اے اللہ میں
قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ	آپ سے جنّت کا سوال کرتا

ہوں اور ان چیزوں کا جو جنّت کے قریب کرنے والی ہوں وہ خواہ قول ہو یا عمل

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنّت کا سوال کرنا کوئی

گھٹیا حالت نہیں اگر یہ گھٹیا حالت ہوتی تو حضورؐ اس کا سوال نہ
فرماتے تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ارفع حالت ہے اس نیت سے عمل کرنا
کہ جنت ملے گی وہ درحقیقت رضائے محبوب کے لئے ہی عمل کرنا
ہے اور یہ پہلے بتا چکا ہوں کہ عاشق کو تو محبوب کی ادنیٰ ادنیٰ چیز
سے محبت ہوتی ہے بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنّت کا سوال
کرنا اسی بنا پر تھا کہ وہ خدا کی چیز ہے اور اس کے مانگنے کا
حکم فرمایا ہے اور جب محبوب کی یہ خواہش ہو کہ میری چیز مجھ سے
مانگو تو اس وقت مانگنا ہی موجب رضا ہے ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

جب حق تعالےٰ ہی ہم سے طمع چاہیں تو پھر قناعت پر خاک
ڈالو، عارف کامل تو خدا تعالےٰ کی ادنیٰ نعمت سے بھی استغناء
ظاہر نہیں کرتا چہ جائیکہ جنت سے جو اعلیٰ نعمتوں میں سے ہے،
استغناء ظاہر کرے!

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت کا سوال اس بنا پر

بھی تھا کہ وہ محل دیدار ہے تو درحقیقت یہ جنت کا سوال نہ تھا بلکہ محبوب کے دیدار کا سوال تھا کسی نے خوب کہا ہے ؎

عاشقانِ جنت برائے دوست میدارند دوست

یعنی جو لوگ عاشق ہیں وہ تو جنت اسی لئے طلب کرتے ہیں کہ وہاں دوستوں سے ملاقات ہوگی، چنانچہ کسی بزرگ کا ارشاد ہے کہ جب سے مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ جنت میں دوستوں سے ملاقات ہوگی۔ اس وقت سے جنت کا شوق ہوگیا ہے تو اس نیت سے کسی مومن کا جنت کا سوال کرنا اور اس کی طرف راغب کرنے والی چیزوں پر عمل کرنا یہ مقام ارفع بھی ہے اور ایک بات اس سے بھی زیادہ باریک ہے، وہ یہ ہے کہ بعض دفعہ جنت کی طلب کا منشاء محض یہی نہیں ہوتا کہ وہاں خدا تعالیٰ کا دیدار ہوگا، بلکہ اس خیال سے بھی اس کی تمنا کی جاتی ہے کہ ہم اس قابل کہاں کہ دیدار کی تمنا کریں، آؤ کم از کم برائے دیدار ہی کی زیارت کرلیں تو یہ بھی بڑی بات ہے، ہمارے دادا پیر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کا ارشاد ہے کہ وہ لوگ بڑے

خوش نصیب ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کی تمنا کرتے ہیں ہم تو اپنے آپ کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ قبہ خضراہی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ سکیں۔ آہ سہ

مرا از زلفِ تو موئے بسندست

ہوس راراہ مدہ بوئے بسندست

مجھ کو تو تیری زلف کا ایک بال بھی کافی ہے رائے دل ہوس اختیار نہ کر کہ یہاں تو اگر خوشبو بھی میسر آجائے تو بھی غنیمت ہے۔

اور بعض دفعہ جنت کے سوال کا منشا رغلبۂ تواضع بھی ہوتا ہے کہ عاشق اپنے کو وصالِ محبوب کے قابل ہی نہیں سمجھتا اس لئے تمنا کرتا ہے کہ میں اس کے دیکھنے کے تو لائق ہوں نہیں کاش اس کے شہر ہی میں جا رہا ہوں،

اور کبھی اپنی احتیاج اور افتقار ظاہر کرنے کے لئے جنت کی تمنا کی جاتی ہے کہ اے اللہ! میں آپ کی رضا کا تو محتاج کیوں نہ ہوتا میں تو جنت تک کا محتاج ہوں جو کہ رضا کے مقابلہ میں کہیں ادنیٰ درجہ کی چیز ہے۔ تو غرض مختلف لوگوں

مختلف نیتیں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے جنت کا سوال کیا جاتا ہے،
اور ان چیزوں پر عمل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو اس
کے قریب کرنے والی ہیں مقصود سب کا رضائے الٰہی ہی ہے، مگر
اس کے حصول کے طریقے مختلف ہیں یہاں تک تو محبت کی قسموں
کا ذکر تھا کہ خواہ محبت بلا واسطہ ہو یا بواسطہ، ے

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف
گر بکشد زہے شرف ور بکشم زہے طرب

قسمت نے اگر یاوری کی تو اس کا دامن پکڑ لوں گا،
اگر میں نے اپنی طرف کھینچ لیا تو اچھا اور اگر اس نے کھینچ لیا تو بہت
ہی اچھا ہے۔

حق تعالیٰ سے خوف کی مختلف صورتیں

پس جیسے محبت کی
مختلف صورتیں ہیں اسی طرح خوف کی بھی مختلف صورتیں ہیں
کسی کو حق تعالیٰ کی ذات کا خوف، اس کی عظمتِ شان
اور جلالت کی وجہ سے ہوتا ہے، اور کسی کو آخرت کے عذاب

وعقاب کا خوف ہوتا ہے۔ یہ دونوں طریقے یہی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں، چنانچہ حق تعالیٰ نے بھی اپنے عذاب وعقاب سے بندوں کو ڈرایا ہے، بعض طبائع پر جلالت وعظمتِ حق کا انکشاف نہیں ہوتا ان کے لئے خوف عذاب ہی گناہوں سے مانع بنجاتا ہے پس جو لوگ عذاب کے خوف سے عمل کرتے ہیں ان پر بھی کوئی اعتراض نہیں اور ان کی یہ حالت گھٹیا نہیں بلکہ رفیع حالت ہے گو اس سے ارفع اور بلند حالت یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی عظمت اور اس کی جلالتِ شان منکشف ہو کر گناہوں سے مانع ہو۔

پس یہاں تک (ذکر) یاد کی دو قسموں کا بیان ہوا جس کا دوسرا نام یادالٰہی بھی ہے، یعنی یاد کی دو قسمیں بیان ہوئیں کہ ایک یاد محبت کیوجہ سے ہو، اور ایک یہ کہ یاد خوف کی وجہ سے ہو،

اس کے علاوہ ایک

یادالٰہی کی تیسری صورت

تیسری قسم اور بھی ہے، جس کو یادِ حیاء کہا جاتا ہے اور یہ تیسری قسم ان لوگوں کے لئے ہے جن کے طبائع پر حیاء کا غلبہ ہے اور اسی غلبۂ حیاء بر

کی وجہ سے ذکر اللہ اور اعمالِ صالحہ کرتے ہیں، ان کو اپنے خالق اور محبوب کی یاد سے غافل ہوتے ہوئے شرم آتی ہے، خوف یا محبّت ان کے لئے ذکر و طاعت کا محرک نہیں ہوتا بلکہ محض حیار کیوجہ سے سب کچھ کرتے ہیں، گو یہ حضرات محبت سے خالی نہیں ہوتے، البتہ اس کا غلبہ نہیں ہوتا، غلبہ صرف حیار ہی کا ہوتا ہے غرض، کسی پر خوف کا غلبہ ہے، کسی پر محبت کا، اور کسی پر حیار کا جس پر جس صفت کا غلبہ ہوا وہی اس کے لئے ذکر طاعت کا سبب اور داعی بن گیا، اگر کسی میں حیار غالب ہے تو یہی صفت اس کے لئے ذکر اللہ کا باعث بن جاتی ہے، خواہ یہ حیار اس کی ذات سے ہو، یا اس کے انعامات و احسانات کی بنا پر ہو۔

حبِ ذکر

ذکر کا کوئی متعین اثر مطلوب ہونا چاہیئے کی اتنی صورتیں ہیں اور ان سب کا مقصد ایک ہی ہے اور وہ ہے وصول الی المطلوب، کہ کسی طرح مطلوب اور مقصود تک رسائی ہو جائے تو پھر ذکر و شغل کرنے کے اس بات کے خواہش مندمت بنو کہ

ہم کو خوف یا اس کی محبت درجۂ غالب میں حاصل ہو جائے یا ہم پر فلاں کیفیت طاری ہو جائے، کیونکہ یہ سب چیزیں غیر اختیاری ہیں اور غیر اختیاری اُمور کا بندہ مکلّف نہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب عرصہ تک ذکر کرکے یہ چیزیں حاصل نہ ہوں تو افسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہائے ہم پر فلاں کیفیت کیوں نہیں غالب ہوئی۔ تم کو کیا خبر ہے کہ تمہارے لئے کونسی کیفیت مناسب ہے اور کونسی نہیں، خوف کا راستہ مناسب ہے یا محبّت وحیا کا وہ کسی کو ہنسا کر پہنچاتے ہیں، کسی کو رُلا کر اور کسی کو نہ ہنساتے ہیں اور نہ رلاتے ہیں بلکہ حسرت اور پریشانی میں مبتلا رکھ کر پہنچاتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

بگوشِ گل چہ سخن گفتہ کہ خندان ست
بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان ست

تم نے پھول کے کان میں کیا بات کہدی کہ وہ ہنس رہا ہے اور بلبل سے تم نے کیا کہدیا کہ وہ رو رہی ہے۔

غرض جس کو محبوب کے ہاتھ سے جو بھی مل گیا اسی کو اپنے

حق میں بہتر اور اچھا سمجھنا چاہیئے اور اسی پر راضی رہنا چاہیئے جنہوں نے اس راز کو سمجھ لیا وہ ہر حال میں راضی رہتے ہیں، اگر ان پر خوف کا غلبہ ہے تو محبّت کے غلبہ کے طالب نہیں ہوتے، اگر کسی پر حیاء غالب ہے تو وہ محبّت اور خوف کا طالب نہیں ہوتا وہ ہر حال میں یہی کہتا ہے، ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم در کش
کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف ست

شراب گدلی ہے یا صاف تم کو اس بارے میں رائے زنی کا کوئی حق نہیں خاموش رہو کہ ساقی نے جو کچھ بھی پیمانے میں ڈال دیا اُس کا عین کرم ہے۔

سالکین کو انتباہ یہ بات خصوصیّت سے ذاکرین کے کام کی ہے کیونکہ ان کو بڑی حرصیں ہوتی ہیں، ان میں حالات و کیفیات اور بڑے مقامات کی تمنّا کا مرض بہت ہوتا ہے اور نیز اس قسم کی تمنّا خلاف عبدیت بھی ہے۔ عبدیت کاملہ اسی میں ہے کہ اپنی تمام خواہشات

اور تمناؤں کو حق تعالیٰ کی خواہش میں فنا اور اس کے تابع کر دے، بعض ذاکرین ذکر کر کے شکایت کرتے ہیں کہ ذکر میں مزہ نہیں آتا، ہائے! یہ ساری عمر نفس کے مزے ہی میں پڑے رہیں گے۔ محبوب کیطرف کب متوجہ ہوں گے، یاد رکھو عاشق کا مذہب یہ ہونا چاہیئے، ؎ عشق آن شعلہ است کو چوں برفروخت

ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

عشق وہ آگ ہے کہ جب یہ بھڑکتی ہے تو معشوق کے سوا باقی ہر چیز کو جلا دیتی ہے اور فرماتے ہیں کہ

تیغِ لا در قتل غیرِ حق براند؞

درنگر آخر کہ بعد لا چہ ماند؞

جب غیرِ حق کے فنا کرنے کے لئے لا کی تلوار چلائی تو دیکھو لا کے بعد کیا رہ گیا۔

ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت

مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

جبکہ لا الٰہ الا اللہ کہہ یا تو اللہ تعالیٰ کے سوا سب منفی

ہو گئے پس ظاہر ہے کہ الا اللہ رہ گیا اور باقی سب ختم ہو گیا

مبارک ہو اے عشق تجھ کو جو شرکت غیر کو جلادے۔

اب نہ کسی خاص کیفیت کے طالب بنو اور نہ کسی خاص

مقام کے بلکہ صرف خدا کے طالب بنو اور اگر کچھ بھی نہ

ملے تب بھی راضی رہو کسی نے خوب کہا ہے ؎

گر مرادت را مذاق شکر است

بے مرادی نے مراد دلبر است

یعنی ہم نے مانا کہ تمہاری مراد بہت عمدہ ہے مگر ذرا

سوچو تو سہی کہ اپنے دلبر (معشوق) کی مراد یہ ہے کہ تم

نامراد رہو، تو کیا اس کی مراد تمہاری مراد سے افضل نہ ہوگی

اب سے تمہاری مخترعات (گھڑی ہوئی مرادیں) نہ ملیں

تو وہ خود تو تم کو مل جائیں گے۔ اور جب وہ مل گئے تو پھر

سب کچھ مل گیا۔ اسی کو کہا ہے۔ ؎

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند

فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

جس شخص کو آپ کی معرفت حاصل ہو گئی اس کو جان اور فرزند اور اسباب کا حاصل ہونا یا نہ ہونا دونوں ایک اور برابر ہیں۔

میرے بھائیو! اور عزیزو!

ذکر و فکر ہی مقصود ہے بندہ کا کام صرف یہ ہے کہ خدا تعالے کی یاد میں لگے اور ذکر و فکر ہی کو مقصود سمجھے، کسی کیفیت پر نظر نہ رکھے۔

غرض حق تعالے نے ہمیں اس طرح خطاب فرمایا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا	تم ان لوگوں کی طرح
اللّٰهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ	نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ

کو بھلا دیا اور جنہوں نے ایسا کیا پس اللہ تعالے نے بھی ان کو بھلا دیا، پس کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بھی خدا کو بھولنے والوں میں شمار ہو جائیں اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر ہم اس ارشاد

أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝	یہی لوگ ہیں نافرمان

کے مستحق ہو کر نافرمانوں میں داخل ہو جائیں گے۔

نسیان کا علاج اور گناہوں سے بچنے کا طریقہ

تو بد حالی کا سبب نسیان تھا اور اس نسیان کا علاج ذکر اور فکر ہے، تو اب اس بد حالی اور گناہوں سے بچنے کا ایک طریقہ اور نکلا اور وہ نہایت آسان ہے۔

وہ طریقہ یہ ہے کہ ایک وقت تنہائی کا حسب فرصت مقرر کر لیا جائے اور اس میں کچھ دیر بیٹھ کر ذکر اللہ (اللہ اللہ) کیا جائے، مگر وہ ذکر ایسا ہو کہ زبان و دِل دونوں اس میں شریک ہوں۔ ورنہ پھر وہ حالت ہو گی ؎

سبحہ در کف توبہ بر لب دل پُر از ذوق گناہ

معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما!

ہاتھ میں تسبیح، لب پر توبہ اور دل میں گناہوں کی لذت بھری ہوئی ہے تو ہماری توبہ سے گناہوں کو بھی شرم آتی ہے کہ یہ عجیب توبہ کر رہا ہے کہ پھر گناہ کا قصد ہے کہ موقع ملا تو پھر گناہ کر دوں گا۔

ایسی زبانی یاد جلدی مؤثر نہیں ہوتی، یاد خدا کے لئے

ذکر اللہ وہی جلدی رنگ لاتا ہے جو دل و زبان دونوں سے ہو، جب اللہ کا نام لینے بیٹھو تو دل میں ماسوا اللہ کے کوئی خیال (قصداً) نہ لاؤ اور اگر خود بخود آجائے تو وہ تم کو کچھ مضر نہیں۔

اس کو یوں سمجھو کہ ایک سرکاری آدمی پہرہ پر کھڑا کیا گیا ہو کہ دربار میں کسی کو نہ آنے دے۔ اب اگر وہ سنتری خود ہی باغی کو اندر بلالے تو مجرم ہوگا لیکن اگر وہ باغی جبر کرکے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر جلدی سے اندر گھس آئے تو اس سے سنتری مجرم نہ ہوگا، اسی طرح نماز اور ذکر میں خود وساوس لانا یا ان میں مشغول ہو جانا بُرا اور مذموم ہے لیکن اگر خود نہ لائے اور نہ ادھر متوجہ ہو تو کچھ ضرر نہیں، رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹہ تو ایسا نکال لو جس میں اس طرح اللہ کا ذکر کر لیا کرو، وہ ذکر خواہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا ہو یا اللہ اللہ کا ہو بس اس طرح روزانہ ایک گھنٹہ پورا کر لیا کرو۔

حضرات! میں آپ کو عجیب بات بتلا رہا ہوں بخدا ذکر

کی پابندی کے ساتھ اوّل تو آپ سے گناہ ہی نہ ہوں گے اس بدحالی میں مبتلا ہونا ہی ختم ہو جائے گا، اور اگر نفس و شیطان سے مغلوب ہو کر گناہ ہو بھی گیا تو فوراً دل کے نور میں کمی معلوم ہو گی دل پر آرے چلیں گے، فوراً دل پر نشتر سا لگے گا بدوں توبہ کے چین ہی نہ آئے گا، توبہ کی طرف جھکنا پڑے گا تو پھر انشاء اللہ اس کا یہ اثر ہو گا کہ ایک ایک کر کے سب گناہ چھوٹ جائیں گے کس قدر سہل نسخہ ہے، فسق و بدحالی کا حالت سے بچنے کا اور اجتناب کرنے کا۔ ایسے آسان نسخہ پر بھی عمل نہ ہو سکے تو اس کے لئے کہا جائے گا ؎

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو بھی کسی قابل ہوتا

خلاصہ وعظ کا یہ ہے کہ اس آیت میں اولٰئک

حاصل کلام هُمُ الْفٰسِقُوْنَ کو نَسُوا اللّٰهَ پر مرتب کیا ہے، جس سے اس نسیان کا سبب فسق اور معصیت کا بدحالی ہونا ظاہر ہوا اور اس سے بچنے کے لئے ذکر اللہ

لازم ہے۔ پس حق تعالےٰ نے اپنے اس کلام میں اسی پر مسلمانوں کو متنبّہ کیا ہے اور محبّت بھرے عنوان اور پیارے لہجہ میں فرمایا ہے کہ

اے! مسلمانو! تمھیں یہ کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ تم اللہ کے ذکر اور اس کی یاد سے غافل اور اس کے بھولنے والے ہو جاؤ، جیسے کفار نے اللہ کو بھلا دیا ہے، کہاں وہ اور کہاں تم!

میرے عزیز و اور بھائیو! خدا تعالیٰ کے اس فرمان کو سننے کے بعد چاہیئے کہ ہم اللہ کے ذکر اور اس کی یاد کو اپنے لئے لازم حیات کرلیں اور برابر توفیق کی دعا کرتے رہیں۔ تاکہ ہم بالآخر فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ کے مصداق بن جائیں

اب میں اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو ذکر و طاعت کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

عالم ربانی مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب شروانی دامت برکاتہم کے مواعظ

(۱) ذکر الٰہی — جسمیں ذکر خداوندی کی عظمت ضرورت و افادیت کو نہایت ہی دلپذیر اور موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے

(۲) التوحید الحقیقی — جسمیں توحید کے مضمون کو پوری جامعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(۳) حفظ المسلم — جس میں حدیث پاک (المسلم من سلم المسلمون الخ پر ہاتھ اور زبان سے ایذا نہ پہنچائے) اور مسلمان کے حقوق کے بیان میں مفصل بیان کیا گیا ہے۔

(۴) فضیلت طہارت — جس میں طہارت کے جملہ مسائل بیان فرمایا ہے۔

(۵) فضیلت علم — آیۂ کریمہ ہل یستوی الذین یعلمون الخ علم کی فضیلت پر بے نظیر وعظ جو آپ نے رمضان المبارک میں جمعہ کے روز فرمایا۔

(۶) تعلیمات اسلام ہر چہار حصہ مکمل۔ جس میں دلنشین اور مدلل پیرایہ میں بچوں کو عقاید سمجھایا گیا ہے۔ داخل درس کرنے کے قابل کتاب ہے۔